علم التعلیم

گیارہویں جماعت کے لیے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

اپیل

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ آپ کا اپنا ادارہ ہے جو پنجاب کے طلبہ و طالبات کے لیے معیاری اور سستی کتب مہیا کرتا ہے۔ جن پر بورڈ کا مونوگرام موجود ہوتا ہے۔ ان کی تیاری ماہرین کی زیرِ نگرانی کی جاتی ہے تاکہ بچوں میں تخلیقی صلاحیتیں اجاگر ہوں۔ کچھ ناشرین ایسی کتب شائع کرتے ہیں جن میں سوالاً جواباً مختصر مواد ہوتا ہے۔ ان کتب میں ٹیسٹ پیپرز، گائیڈز، خلاصہ جات وغیرہ شامل ہیں۔ ایسی کتب کورٹ لینے سے طلبہ و طالبات امتحان تو شاید پاس کرلیں مگر ان کی ذہنی تربیت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ ایسے بچے اعلیٰ پیشہ ورانہ اداروں میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

محترم والدین، اساتذہ کرام اور عزیز طلبہ و طالبات کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ کسی قسم کی غیر معیاری کتب خریدنے کے پابند نہیں ہیں اور اگر کوئی فرد انہیں اس سلسلے میں مجبور کرے تو چیئرپرسن، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کو اطلاع دیں۔

ڈاکٹر فوزیہ سلیمی
پی ایچ ڈی فزکس (گلاسگو)
(ستارۂ امتیاز، اعزازِ فضیلت)
چیئرپرسن
پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ
21-E-II، گلبرگ III لاہور

علم التعلیم

حصہ اول

(اساسیاتِ تعلیم)

اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے لئے

Curriculum Development & Text Book Production
096
LIBRARY
H-9, Islamabad

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

جملہ حقوق بحقِ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور محفوظ ہیں۔
تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

مصنفین : منور ابن صادق۔ ڈاکٹر انجم رحمانی۔ محمد جلیل جاوید
مدیران : مرزا محمد شفیع۔ مسعود میاں صدیقی

نگران طباعت : شگفتہ صابر

ناشر: عظیم اکیڈمی لاہور

مطبع: حفیظ پریس لاہور

فہرستِ عنوانات

پیش لفظ

پہلا باب تعلیم اور اس کا مفہوم صفحہ 1

تعلیم کا مفہوم ۔ تعلیم کا دائرۂ کار ۔ تعلیم کے بنیادی عناصر ۔
تعلیم کے وظائف ۔ تہذیبی ورثے کا تحفظ اور منتقلی ۔ معاشرتی زندگی کی تشکیلِ نو ۔ فرد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل ۔

دوسرا باب اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم کی بنیادیں 19

اسلامی نظریۂ حیات ۔ تعلیم کی تعریف ۔ مقاصدِ تعلیم ۔ تعلیم کی اہمیت ۔ علم اور اس کے ذرائع ۔

تیسرا باب تعلیم کی فلسفیانہ بنیادیں 32

فلسفہ کیا ہے؟ فلسفے کا دائرۂ عمل ۔ فلسفے اور تعلیم کا باہمی تعلق ۔ ترقی پسندیت روایت پسندیت ۔ اسلامی نظریۂ حیات ۔

چوتھا باب تعلیم کی معاشرتی اور معاشی بنیادیں 47

معاشرہ اور تعلیم ۔ تعلیم اور معاشیات ۔ افرادی قوت اور تعلیم
تعلیمی سرمایہ کاری ۔ فوائدِ تعلیم ۔

پانچواں باب : تعلیم کی نفسیاتی بنیادیں 64

نفسیات اور اُس کا تعلیمی دائرۂ کار - نشوونما اور اس کے تعلیمی تقاضے -
نشو و نما کے مدارج اور ان کے تعلیمی تقاضے - نشو و نما کی تعلیمی اہمیت -
تعلم کا مفہوم - تعلم کی شرائط - تحریک اور تعلم - فراموشی - انتقالِ تعلم - انتقالِ
تعلم کے نظریات - مُوثر تعلم کے اصول - ذہنی صحت اور تعلم -

چھٹا باب : تعلیمی فکر میں مسلمانوں کا حصّہ 93

ابن سینا - علامہ زرنوجی - ابن جماعہ

ساتواں باب : نصابِ تعلیم 112

اچھے نصاب کی خصوصیات - مُوثر تدریس کی خصوصیات - جائزہ - تعلیمی پیمائش

پیش لفظ

عِلم التعلیم گیارھویں بارھویں جماعتوں میں ایک انتخابی مضمون کی حیثیت سے شامل نصاب ہے ۔ اس مضمون کے نصاب کی تشکیل میں یہ روح کارفرما تھی کہ طلبہ تعلیم کو ایک معاشرتی عمل کی حیثیت سے سمجھ سکیں اور اس سے متعلق امور و مسائل کا واضح شعور حاصل کر کے ایک اچھے شہری کے طور سے مؤثر کردار ادا کر سکیں اور اگر معلمی اختیار کریں تو ذہن و قلب کی پوری یکسوئی کے ساتھ اسے ایک اعزاز ، ایک مشن اور ثواب کا کام سمجھ کر اختیار کریں ۔

عِلم التعلیم کے متعینہ مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے عِلم التعلیم کے نصاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے :-

پرچہ الف : اساسیات تعلیم ، پرچہ ب : جنوبی ایشیا میں تعلیم کی تاریخ ۔

زیرِ نظر کتاب پرچہ الف کے لوازمۂ نصاب پر مشتمل ہے ۔ اس کے سات ابواب میں تعلیم کے مفہوم ، دائرۂ کار ، اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کے تصورات ، تعلیم کی فلسفیانہ ، معاشرتی ، معاشی اور نفسیاتی بنیادوں ، نامور مسلمان مفکرین کے تعلیمی تصورات اور نصاب کا جائزہ لیا گیا ہے ۔

اوپر بیان کردہ موضوعات سے معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ نظر کتاب نظری اعتبار سے علم التعلیم کے جملہ بنیادی پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کتاب کے سنجیدہ مطالعے کے بعد طلبہ معاشرتی عمل اور نظامِ حیات کے ایک اہم ذیلی نظام کے طور سے علم التعلیم کا شعور حاصل کر لیں گے اور اس کے متعلقہ امور و مسائل سے آگاہی حاصل کر کے معاشرے کی بہتر خدمت کے قابل ہو جائیں گے ۔

نصابی کتاب کتنی بھی اچھی ہو بہرحال اس کی اپنی کچھ حدود ہوتی ہیں ۔ اسے خاکۂ نصاب کی حدود میں رہنے کی خاطر اپنا دامن سمیٹ کر چلنا ہوتا ہے ۔ تاہم امید کی جاتی ہے کہ معلمینِ کرام طلبہ کی بھرپور رہنمائی فرما کر نصابی کتاب کو موثر آلۂ تعلم بنائیں گے اور نصابی کتاب کی اصلاح کے لیے مفید تجاویز سے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور کو مطلع فرمائیں گے ۔

محمد شفیع مرزا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب:

تعلیم اور اِس کا مفہوم

تعلیم کا مفہوم

تعلیم ایک ایسی ہمہ گیر اصطلاح ہے، جس کا مفہوم ایک جملے میں ادا نہیں ہو سکتا۔ اپنی اصل کے اعتبار سے تعلیم لفظ علم سے ماخوذ ہے جس کے معنی جاننا، پہچاننا یا معلومات رکھنا ہیں۔ یعنی تعلیم ایسا عمل ہے جس کے ذریعے فرد کی خاص سمت میں رہنمائی کی جاتی ہے اور اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے اور نکھارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تعلیم کے مفہوم کے بارے میں مختلف ماہرین اور مفکرین نے مختلف آرا کا اظہار کیا ہے۔ بعض مفکرین نے تعلیم کو انسان کی ذہنی نشو و نما کا نام دیا ہے اور بعض اسے فرد کی شخصیت کی تکمیل کا عمل کہتے ہیں۔ کچھ ماہرین، تعلیم کو ایک ایسا معاشرتی عمل قرار دیتے ہیں جس کا مقصد معاشرتی تسویہ (Social Adjustment) ہے۔ جبکہ بعض کے نزدیک تعلیم تہذیبی ورثے کی نسل در نسل منتقلی کا نام ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ تعلیم اعلیٰ کمال کے حصول اور منتقلی کا عمل ہے جبکہ ایک دوسری رائے یہ ہے کہ تعلیم انسان کے اندر کی فطری نیکی کو ظہور میں لانے کا عمل ہے۔

قدیم مفکر سقراط (Socrets) کے نزدیک تعلیم اس سچائی کو تلاش کرنے اور فرد کو اس سے روشناس کرانے کا عمل ہے جو اس کے ذہن میں پوشیدہ ہوتی ہے جبکہ ارسطو (Aristotle) کہتا ہے کہ تعلیم بچے کے مکمل جسمانی اور اخلاقی نشوونما کا عمل ہے۔ افلاطون (Plato) کے نزدیک تعلیم ایسا عمل ہے،

جو ایک صحت مند معاشرے کی تنظیم کا کام انجام دیتا ہے ۔ اس میں فرد کی جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کی اس طرح پرورش کی جاتی ہے کہ اس کی شخصیت کی تکمیل میں حتی الامکان کوئی کمی نہ رہے ۔

جدید ماہرین تعلیم میں جان ڈیوی (John Dewey) کا نام بہت نمایاں ہے۔ اس کے خیال کے مطابق تعلیم تجربات کی مسلسل تعمیرِ نو کا نام ہے۔ تعمیر نو کے اس عمل سے تجربات میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے اور یہ تجربات فرد کے مستقبل کے تجربات کے لئے راہِ عمل متعین کرنے میں رہنمائی کرتے ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے سے انسان کی شخصیت کی ہمہ پہلو تربیت اور اس کے کردار کی تشکیل کی جاتی ہے تاکہ وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کے منصب کا اہل بن سکے ۔

قدیم اور جدید مفکرین کی آرا کا مطالعہ کرنے سے تعلیم کی مندرجہ ذیل توجیہات سامنے آتی ہیں ۔

(1) تعلیم سچائی کو پانے کی جستجو کا عمل ہے جو ہر انسان کے ذہن میں پوشیدہ ہوتی ہے ۔
(2) تعلیم تہذیب و تمدن کی تجدید اور تعمیرِ نو کا عمل ہے ۔
(3) تعلیم فرد کی مکمل ذہنی ، جسمانی ، اخلاقی ، روحانی اور جذباتی قوتوں کی مربوط اور مسلسل نشوونما اور توسیع کا عمل ہے ۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم ان تمام عناصر کا مجموعہ ہے جو فرد اور معاشرے کے خیالات و نظریات اور طرز فکر و عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ یوں تعلیمی عمل تمام زندگی جاری رہتا ہے ۔

دوسرے الفاظ میں تعلیم ایک ایسا معاشرتی عمل ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کی نشو و نما کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ یہ نشوونما اس طرح سے مربوط اور بتدریج ہوتی ہے کہ اس سے فرد کی شخصیت کی بہترین طور پر تکمیل ہو سکے اور فرد نہ صرف خود کو پہچاننے کے قابل ہو بلکہ کائنات اور خالقِ کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت بھی حاصل کرے ۔

تعلیم کا دائرہ عمل

رسمی اور غیر رسمی تعلیم :

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بچوں کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے لیے تعلیم کا اہتمام و انتظام نہایت ضروری ہے ۔ تعلیم کا یہ اہتمام دو ذرائع سے کیا جاتا ہے اور اس حوالے سے تعلیم کو رسمی اور غیر رسمی دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔ ایسی تعلیم کو جو مدرسوں ، سکولوں ، کالجوں کے زیر اہتمام دی جاتی ہے "رسمی تعلیم" کہتے ہیں رسمی تعلیم کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں بچوں کی صلاحیتوں کے پیش نظر باضابطہ طور پر تعلیمی اصولوں کے مطابق ان کی شخصیت و کردار کی تربیت کی جاتی ہے ۔ جبکہ غیر رسمی تعلیم میں بچہ تعلیمی ادارے کے بجائے اپنے والدین یا کسی ماہرِ فن سے کسی ہنر کی تربیت حاصل کرتا ہے اور کچھ دوسرے ذرائع اور مواقع سے بھی اثر قبول کرتا ہے ۔ یہ ذرائع گھر ، خاندان ، محلہ ، کھیل کود کے میدان ، بازار ، منڈی اور سیروسیاحت وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں ۔

گویا رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے بیشمار مواقع اور تجربات کی بنا پر افراد کی شخصیت کی تعمیرو تشکیل ہوتی ہے اور معاشرے کا ہر فرد کسی نہ کسی طریقے پر اس تعلیمی عمل میں اپنا کردار ادا کرتا ہے نیز فرد کی شخصیت کی تعمیر کا عمل چند سال یا اس کی عمر کے کسی خاص دور سے متعلق نہیں بلکہ تعلیم کا عمل زندگی بھر ہر حالت میں جاری رہتا ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جامع الفاظ میں یوں فرمایا ہے کہ "مہد سے لحد تک تعلیم حاصل کرو" ۔ اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ تعلیم کا دائرہ عمل نہایت وسیع ہے اور یہ انسانی زندگی کے ہر پہلو ، ہر موقع اور ہر حالت میں جاری و ساری رہتا ہے ۔

تعلیمی عمل کے بنیادی عناصر

تعلیمی عمل کے بنیادی عناصر بالعموم درج ذیل ہیں۔ ان عناصر کے حوالے سے تعلیم کے دائرہ عمل کی وسعتوں کا صحیح تصور قائم ہو سکتا ہے۔

(1) متعلم

(2) تعلم

(3) نصابِ تعلیم

(4) عمل تدریس

(5) معلم

(1) متعلم:

نظام تعلیم میں متعلم کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اگر متعلم کو تعلیم سے خارج کر دیا جائے تو تعلیم کے دوسرے عناصر کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ یہ متعلم ہی ہے جس کی مناسب نشو و نما کے لیے معاشرہ نظام تعلیم قائم کرتا ہے کیونکہ درحقیقت فرد کی تعلیم و تربیت پورے معاشرے کی تربیت ہے۔

تعلیمی عمل کے ایک عنصر کی حیثیت سے متعلم کی شخصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے مثلاً متعلم عمر کے کس حصے میں ہے؟ اس عمر کے تقاضے کیا ہیں؟ اس سطح پر فرد کی صلاحیتیں کیا ہوتی ہیں؟ ضرورتیں اور دلچسپیاں کیا ہوتی ہیں؟ یہ سب معلومات تعلیم کی صحیح تنظیم کے لیے انتہائی اہمیت رکھتی ہیں۔ عمل کی وسعتوں کا زیادہ تر انحصار متعلم کی حالت پر ہے۔ اسی حوالے سے تعلیم کے لیے سہولتوں اور انتظامات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

فرد اور معاشرہ لازم و ملزوم ہیں آج کے بچے کل کے معاشرے کے سرگرم کارکن ہیں لہٰذا اگر بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ نہ دی جائے تو وہ اپنے ماحول اور تجربات سے جو کچھ سیکھ کر بڑے ہونگے تو ضروری نہیں کہ ان کا معیار معاشرے کے مطلوبہ معیاروں سے مطابقت رکھتا ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی روزی کما لیں اور روح و جسم کا تعلق قائم رکھیں لیکن زندگی کا مقصد صرف زندہ رہنا ہی نہیں بلکہ زندگی اس طرح گزارنا ہے کہ اللہ کی خوشنودی حاصل ہو سکے۔ زندگی کی قدر تو ہر جاندار کرتا ہے لیکن انسانی زندگی عام جانوروں سے مختلف نوعیت کی حامل ہے۔ اس کی زندگی کا ایک واضح اخلاقی پہلو بھی ہے۔ معاشرے میں رہنے والے ہر فرد سے یہ توقع کی جاتی ہے

کہ وہ معاشرے کا ایک مفید رکن ہو ۔ ملک و ملت کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو ۔ اپنے اور دوسروں کے حقوق و فرائض کو نہ صرف سمجھے بلکہ ان کا احترام بھی کرے ۔ تعلیم کا فرض ہے کہ فرد کی اس طریقے سے تربیت کرے کہ فرد اور معاشرے میں توازن قائم رہے ۔

(2) تعلم :

تعلم سے مراد تجربے کے ذریعے انسانی سوجھ بوجھ اور عادات و خصائل میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیاں ہیں ۔ گویا انسان اپنے ماحول کے ساتھ ربط و تعلق کے نتیجے میں جو کچھ سیکھتا ہے اسے تعلم کہتے ہیں ۔

اشیا ، افراد اور واقعات کے متعلق مختلف قسم کے تصورات ، تجربات کے نتیجے میں قائم ہوتے ہیں۔ان کا اظہار انسان موقع و محل کی مناسبت سے کرتا رہتا ہے مثلاً ایک طالب علم کو ہمدردی اور خدمتِ خلق کے تصورات کا شعور اس وقت حاصل ہو گا جب اس کے سامنے کوئی حادثہ پیش آ جائے تو اپنے تعلم کے رد عمل سے فوراً مدد کے لئے آگے بڑھے ۔ ہمدردی کے یہ جذبات تعلم کے زمرے میں آتے ہیں ۔ اسی طرح اگر کسی بچے کو بجلی کا جھٹکا لگ جائے تو وہ آئندہ کے لئے بجلی کی اشیا کے قریب جانے اور ان کو چھونے سے پرہیز کرے گا۔ اس طرح بچے کے ذہن میں واقع ہونے والی یہ تبدیلی تعلم کہلاتی ہے ۔

تعلم کئی قسم کی تبدیلیوں کا نام ہے اور ضروری نہیں کہ ہر فرد میں ایک ہی جیسے حالات میں ایک ہی قسم اور ایک ہی درجے کی تبدیلی ہو ۔ افراد کے تجربات میں ان کی عمر، ان کی ذہنی قابلیت اور معاشرتی ماحول کا خاص دخل ہوتا ہے ۔ اس اعتبار سے عمل تعلم سے متعلق تمام ذمے دار افراد اور اداروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعلم کی حقیقت سے واقف ہوں اور تعلم کو مثبت اور منفی طور سے متاثر کرنے والے عناصر کا واضح شعور رکھتے ہوں ۔ اس شعور کے ساتھ طلبہ کے لیے ایسے تجربات فراہم کئے جانے چاہییں کہ ان میں پسندیدہ اوصاف پیدا ہوں ۔ انہیں علوم و فنون پر خاطر خواہ دسترس حاصل ہو اور وہ عملی زندگی میں مفید شہری ثابت ہوں ۔

(3) نصابِ تعلیم :

مختلف ادوار میں نصابِ تعلیم (Curriculum) کو مختلف معنی دیے گئے ۔ مثلاً شروع میں اسے متعلم کو پڑھائے جانے والے مضامین کا مجموعہ قرار دیا گیا جس میں نفسِ مضمون کو زبانی یاد کر لینا ہی اعلیٰ تعلیمی معیار سمجھا جاتا تھا ۔ پھر مجموعی تعلیمی پروگرام کو نصاب تعلیم کا نام دیا گیا ۔ اس طرح تمام علمی اور فنی تصورات اور تجربات کے علاوہ جملہ تفریحی ، ورزشی ، ادبی اور معاشرتی فعالیتیں بھی نصاب کا حصّہ قرار پاتی ہیں ۔ خواہ ان کا باقاعدہ امتحان لیا جائے یا نہ لیا جائے ۔ الغرض مطلوبہ تعلیم فراہم کرنے کے لیے علوم و فنون اور تجربات و مشاغل فراہم کیے جانے والے تمام لوازمات نصاب کا حصّہ ہیں ۔ یہ تمام لوازمات چونکہ مطلوبہ تعلیم فراہم کرنے کا وسیلہ ہیں لہٰذا عملِ تعلیم میں ان کی اہمیت بالکل واضح ہو جاتی ہے ۔ عمل تعلم میں نصاب تعلیم کی اہمیت کو اس مقولے کی روشنی میں بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ "نظامِ تعلیم میں نصابِ تعلیم کی وہی حیثیت ہے جو نظام مملکت میں آئین یا دستور کی ہے" ۔

نصاب کی اہمیت کے پیش نظر ضروری ہے کہ لوازمۂ نصاب یعنی موادِ نصاب کے انتخاب اور تنظیم کے سلسلے میں متعینہ مقاصد کو سامنے رکھا جائے ۔ عمل تعلم کی حقیقت کا لحاظ رکھتے ہوئے طلبہ کی ذہنی استعداد ، ضرورتوں اور دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ معاشرے کے نظریۂ حیات ، اقدار اور قومی و معاشی تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا جائے تاکہ وہ معاشرے کی بدلتی ہوئی ضروریات کا ساتھ دے سکے ۔ نیز نصاب کی تنظیم میں یہ اصول پیش نظر رہے کہ مستقبل کی ضروریات کے مطابق اس میں ہر چند سال بعد ترمیم و اضافہ ہوتا ہے ۔

(4) عملِ تدریس :

تدریس میں وہ تمام عوامل شامل ہیں جو متعلم کو تعلم کے کسی علمی یا فنی پہلو سے متعلق آمادہ کرنے اور مختلف معلومات بہم پہنچانے کے عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ اس میں وہ تمام راہنمائی اور ترغیبات بھی شامل ہیں جو معلم اپنے متعلم کی شخصیت کی ہمہ پہلو

نشو و نما کے لیے مہیا کرتا ہے ۔ ان حقائق سے تعلم میں تدریس کی اہمیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے ۔

معلم کا واسطہ مختلف اہلیت اور طبیعتوں کے حامل طلبہ سے ہوتا ہے ، اس لیے عمل تدریس میں انفرادی اختلافات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے ۔ اس کے علاوہ متعلم مختلف مضامین کا مطالعہ کرتا ہے اور تمام مضامین ایک ہی طریقۂ تدریس کے ذریعے نہیں پڑھائے جا سکتے ، لہٰذا مختلف مضامین کے لیے مختلف طریقہ ہائے تدریس استعمال کیے جانے چاہئیں ۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں مختلف اور جدید تدریسی وسائل ایجاد ہو چکے ہیں ۔ جدید تدریسی وسائل سے مراد تعلیمی ٹیلی ویژن ، ریڈیو کی تعلیمی نشریات ، فلم سٹرپ ، ٹیپ ریکارڈر اور لسانی تجربہ گاہیں وغیرہ شامل ہیں ۔ ان کے مناسب استعمال سے تدریس کا معیار بہتر ہو جاتا ہے اور اس طرح طلبہ موثر طور پر اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔

(5) معلم :

متعلم کی طرح معلم کو بھی تعلیمی ڈھانچے میں اہم حیثیت حاصل ہے ۔ نصاب اہم سہی لیکن معلم کے فنِ تدریس میں اگر تاثیر نہیں ہو گی تو وہ محض کاغذ کا ایک پُرزہ بن کر رہ جائے گا ۔ معلم ہی وہ ہستی ہے جس کے ذریعے تمام تعلیمی مواد متعلم تک پہنچتا ہے ۔ علوم و فنون کا میدان ہو یا ہم نصابی مشاغل و تجربات ہوں ، ان میں حقیقی روح پھونکنے والی ذات معلم ہی کی ہستی ہے ۔ اسلامی تصور تعلیم میں معلم کو بہت بلند مقام حاصل ہے ۔ خود حضور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کو ذکر و عبادت پر ترجیح دی اور مقامِ محمود پر فائز ہونے کے باوجود فخریہ فرمایا:

"بے شک مجھے معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے۔"[۴]

معلم اپنے علم سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی علم سے فیض یاب کرتا ہے ۔ یہ معلم ہی ہے جو طلبہ کو نہ صرف کتابی علم بہم پہنچاتا ہے بلکہ اس کی ہر معاملہ

میں رہنمائی بھی کرتا ہے اس طرح معلم کی قابلیت ، محنت اور لگن سے طالب علم کی کایا پلٹ جاتی ہے ۔

علامہ اقبال نے بھی معلم کے کام کو صنعت روحِ انسانی کی تشکیل قرار دیا ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔

سہ شیخ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روح انسانی

معلم کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں تدریس کا مناسب طبعی رجحان بھی موجود ہو ۔ کسی مجبوری کے تحت پیشۂ تدریس اختیار کرنے والے کے لیے اچھا معلم بننے کے امکانات بہت محدود ہوتے ہیں ۔ معلم میں معاشرتی سلیقے کی موجودگی کا ہونا بھی ضروری ہے، تاکہ وہ بچوں میں بہتر معاشرتی اقدار کو فروغ دے سکے جو تعلیم کا ایک بنیادی مقصد ہے ۔

تعلیم کے وظائف
(Functions of Education)

ماہرین تعلیم نے تہذیب و ثقافت کے حوالے سے تعلیم کے درج ذیل تین وظائف بیان کیے ہیں ۔ تعلیم کے یہ وظائف انسان کی ذات کی تکمیل اور معاشرے کی تشکیل کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی عمل میں ان کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا:

(1) تہذیبی ورثے کا تحفظ اور منتقلی
(2) معاشرتی زندگی کی تشکیلِ نو
(3) فرد کی بنیادی، ضروریات کی تشکیل

(1) تہذیبی ورثے کا تحفظ اور منتقلی :

ہر باشعور شخص اپنے آباؤ اجداد کے ورثے کو عزیز رکھتا ہے بلکہ بعض اوقات تو لوگ اس معاملے میں اتنے جذباتی ہو جاتے ہیں کہ اپنے باپ دادا کی غیر معقول روایات سے جدا ہونا بھی گوارا نہیں کرتے اس رویے کی تائید تو نہیں کی جا سکتی لیکن آباؤ اجداد کے ورثے سے معقول وابستگی بہرحال عام انسان کی زندگی میں استحکام پیدا کرتی ہے ۔ یہی حال معاشرے اور قوم کا بھی ہے ۔ کوئی بھی معاشرہ اپنے تہذیبی ورثے کے تحفظ اور تسلسل کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ۔ تہذیبی ورثے کے تحفظ اور تسلسل کا یہ فریضہ تعلیم سر انجام دیتی ہے ۔ تعلیم کے ذریعے سے معاشرہ اپنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے آئندہ نسلوں کی طرف منتقل بھی کرتا ہے ۔

تعلیم کی ابتدا اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ انسانی تہذیب و تمدن ۔ انسانی ارتقاء کے ابتدائی دور میں بھی والدین اپنا علم و فن اپنی اولاد کو منتقل کرتے تھے ۔ انسان کی سب سے بڑی ضرورت زندگی کی بقا اور افزائش نسل ہے ، جس کے لیے خوراک اور ذاتی تحفظ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے ۔ زمانہ قبل از تاریخ میں باپ اپنے بیٹوں کو باقاعدہ شکار کرنے اور خود کو دشمن اور درندوں سے محفوظ رکھنے کی تربیت دیتا تھا ۔ اسی طرح ماں بیٹیوں کو کھانا پکانے اور بچوں کی پرورش کرنے کی تربیت دیتی تھی اور اس طرح سے ایک نسل کا علم و فن آنے والی نسل کو منتقل ہوتا رہتا تھا ۔ انسانی تمدن نے رفتہ رفتہ ترقی کی منازل طے کیں اور معاشرے کی ہیئت میں مزید وسعت پیدا ہوتی گئی ۔ لوگوں کو مل جل کر رہنے کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی گئی اور مواقع بھی بڑھتے گئے ۔ اس طرح تمدنی اور معاشرتی ارتقا کے نتیجے میں انسانی ضروریات اور خواہشات میں بھی تبدیلی آتی گئی ۔ چنانچہ بچوں کو معاشرے کی اس تبدیل شدہ صورتِ حال کے لیے تیار کرنے کا کام زیادہ پیچیدہ ہو گیا اور اس سے عہدہ برا ہونا صرف والدین کے بس میں نہ رہا بلکہ اس کے لیے الگ ادارے قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی اور یوں رسمی تعلیم کی ابتدا ہوئی ۔

تاریخِ انسانی کے مختلف ادوار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ نسل در نسل ، انسانی تعلیم و تربیت کے ذرائع مختلف رہے ہیں ۔ ابتدا میں بچوں کی تربیت کی ذمہ داریاں

والدین ، خاندان یا قبیلے کے بڑے افراد پر ہوتی تھیں ۔ وہ اپنے بچوں کو ہر وہ علم و فن سکھاتے تھے جسے وہ خود جانتے تھے یا جن کا جاننا اور سیکھنا اپنے بچوں کے لیے ضروری سمجھتے تھے ۔ اس کے بعد مذہبی رہنماؤں اور اطباء نے نسل در نسل تعلیمی عمل جاری رکھا ۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی یہ تعلیمی عمل اسی طرح جاری ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آج یہ ذمہ داری سکولوں ، کالجوں ، یونیورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں نے لے لی ہے ۔ اسطرح تہذیب و ثقافت مسلسل اگلی نسل میں منتقل ہو رہی ہے ۔ دورِ جدید میں انسان معاشرے کے دوسرے افراد سے لاتعلق نہیں رہ سکتا ۔ اسے ہر قدم پر دوسروں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے فرد حالات کے مطابق فائدہ اٹھا سکتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی سودمند ثابت ہو سکتا ہے ۔

(2) معاشرتی زندگی کی تشکیلِ نو:

اگر تعلیم کا کام صرف تہذیبی ورثے کی منتقلی ہی ہو تو معاشرہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا ۔ اس طرح سے تو آج کا معاشرہ بھی وہی ہوتا جو آج سے ہزاروں سال پیشتر تھا ۔ درحقیقت تعلیم کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ معاشرے کی ترقی اور تشکیلِ نو کے لیے کام کرنے کے ساتھ ساتھ ثقافتی ورثے کی اصلاح کا عمل بھی جاری رکھے اور ایسا اس وقت ممکن ہے جبکہ تعلیمی عمل سے افراد میں تجسس اور تنقیدی جذبات کو جلا دی جائے اور قوت کار کو ابھارا جائے ۔ کسی بھی ترقی یافتہ شعبے کو لیجیے چاہے وہ صنعتی شعبہ ہو ، ادبی یا معاشرتی ، زراعت ہو یا سائنس آپ دیکھیں گے کہ کسی نہ کسی فرد نے موجودہ صورت سے آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے ۔ اس نے اپنے ذہن میں نئے نظریات قائم کیے اور ان کو پرکھنے کے لیے کام کیا اور اس طرح سے نئی نئی راہیں کھلتی چلی گئیں ۔

تعلیمی اور تحقیقی اداروں کا یہ فرض ہے کہ ثقافتی ورثے کا تنقیدی جائزہ لیں اور اس کے مطلوبہ اور غیر مطلوبہ پہلوؤں کو واضح کریں ۔ اس میں مطلوبہ اور پسندیدہ حصے کو مزید نشوونما دے کر آگے منتقل کریں ۔ جدید تحقیقات کی روشنی میں ثقافتی ورثے میں اضافہ بھی تعلیم کی ذمہ داری ہے ۔ اس طرح معاشرتی زندگی کی تشکیلِ نو تعلیم کے اہم وظیفے کی حیثیت رکھتی ہے ۔ بنیادی طور پر تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے جو معاشرے کی بہتری کے لیے

کام کرتا ہے اور معاشرہ ہی اس کا خالق ہے جو اس کے ذریعے اپنے تہذیبی ورثے کو نہ صرف اپنی نئی نسل تک پہنچاتا ہے بلکہ نت نئے تجربات کے ذریعے نئی نسل کو معاشرے کی اصلاح و ترقی کے لیے کام کی ترغیب و تربیت بھی دیتا ہے ۔ ایسے تربیت یافتہ افراد معاشرتی زندگی کی تشکیل نو کا ذریعہ بنتے ہیں ۔

(3) فرد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل :

تعلیمی عمل میں متعلم بنیادی حیثیت کا حامل ہے ۔ تعلیمی عمل کے باقی عناصر کو بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت حاصل ہے ، لیکن یہ امر واضح ہے کہ تعلیمی عمل اور نظام تعلیم کے تمام لوازمات کا مقصود بالآخر متعلم کی تربیت ہی ہوتی ہے ۔ بچّے کی تعلیم و تربیت کی ابتدا اس کی پیدائش ہی سے شروع ہو جاتی ہے اور تمام عمر جاری رہتی ہے ۔ بچّے کے اولین اساتذہ اس کے والدین ہوتے ہیں جو بچّے کے کردار کی تعمیر میں خشتِ اول کی حیثیت رکھتے ہیں اور بچّے کی شخصیت پر انمٹ نقوش چھوڑتے ہیں ۔ پھر جب بچّہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو والدین اسے باقاعدہ تعلیم کے حصول لیے تعلیمی اداروں میں بھیجنا شروع کر دیتے ہیں ۔ بچّہ جب مدرسے میں آتا ہے تو اس کے ذہن پر صرف والدین اور ماحول کی غیر رسمی تعلیم کا اثر ہوتا ہے ۔ رسمی یعنی باقاعدہ تعلیم کا آغاز تعلیمی اداروں میں اساتذہ کے ذریعے ہوتا ہے جو بچّے کو معاشرے اور ملک و ملت کی ضروریات کے مطابق تعلیم دیتے ہیں ۔ بچّہ اپنی روز مرہ زندگی میں نئے نئے تجربات اور اپنے ماحول سے بھی بہت کچھ سیکھتا ہے ۔ اس طرح سے بہت سے عوامل مل کر بچے کی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں ۔ بچّے کی شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ بچّے کی انفرادی صلاحیتوں ، دلچسپیوں اور خواہشات کے ساتھ ساتھ اس کی شخصی اور معاشرتی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ہر پہلو کی مناسب نشو و نما کی جائے ۔ یوں فرد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل یا دوسرے الفاظ میں فرد کی تکمیل ذات تعلیم کے ایک اہم وظیفے کی حیثیت رکھتی ہے ۔

ماہرین تعلیم و نفسیات نے متعلم کی درج ذیل ضروریات کو تعلیمی مقاصد کے لیے اہم قرار دیا ہے :

1 ۔ جسمانی صحت

اچھی صحت خواہ وہ جسمانی ہو یا ذہنی ، کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ کہا جاتا ہے کہ اچھا ذہن ایک تندرست جسم میں ہی ہو سکتا ہے ۔ صحت کے بغیر انسان نہ ہی اپنے کام خوش اسلوبی سے کرنے کا اہل ہوتا ہے اور نہ ہی وہ معاشرے کے لیے سود مند ثابت ہو سکتا ہے اس لیے نظام تعلیم میں بچے کی صحت کا خاص خیال رکھنا بنیادی اہمیت کا حامل ہے ۔

2 ۔ پہچان کی خواہش

بچہ اپنے خاندان یعنی ماں ، باپ ، بہن بھائی اور دیگر قریبی عزیز و اقارب میں اپنی حیثیت کا متلاشی ہوتا ہے ۔ یہ امر بچے کے لیے اعتماد اور سکون کا باعث ہوتا ہے کہ اس کے ماحول میں اس کی حیثیت اور اس کے تشخص کا اعتراف کیا جاتا ہے ۔ بچے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اسے گھرانے کے ایک فرد کی حیثیت سے جانا اور پہچانا جائے اور ساتھ ہی اسے دیگر ہم جولیوں کے مشاغل میں نظرانداز نہ کیا جائے ۔ اس سے بچے کی انا کی تسکین ہوتی ہے ۔

جب بچہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو ذاتی مشاہدات اور تجربات کی بنا پر اس کے خیالات میں بتدریج وسعت آتی جاتی ہے اور وہ خود کو سکول ، گروہ اور مختلف تنظیموں کا رکن تصور کرتا ہے ۔ ان اداروں سے اس یقین دہانی کا خواہشمند ہوتا ہے کہ وہ اسے معاشرے کا ایک فعال رکن تسلیم کرتے ہیں اور اسے مختلف ذمہ داریاں اٹھانے کا اہل سمجھتے ہیں ۔

3 ۔ شہری کے حقوق و فرائض کا علم

متعلم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایسے کام کرے کہ معاشرے میں اسے ایک اچھے شہری کی حیثیت سے پہچانا جائے ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ اچھے برے کی تمیز چاہتا

ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کن باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے ۔ تعلیم کا یہ اہم کام ہے کہ متعلم کو معاشرے کے حقوق و فرائض سے آگاہ کرے تا کہ وہ معاشرے کا ایک کارآمد رکن بن کر ملک و قوم کے لیے بہتری کا باعث بن سکے ۔

4 ۔ تعاون

متعلم معاشرے کا ایک بنیادی رکن ہے ۔ وہ دیگر افراد سے الگ تھلگ زندگی بسر نہیں کر سکتا ۔ اسے جا بجا دوسروں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ خود بھی دوسروں کے کام آنے کا خواہشمند ہوتا ہے ۔ بچوں کے اس جذبے کی مناسب نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ انھیں باہمی تعاون اور اخلاقیات کی تعلیم دی جائے اور ایسے مواقع مہیا کیے جائیں جہاں بچوں کو مل جل کر کام کرنے کی تربیت حاصل ہو ۔

5 ۔ معلومات حاصل کرنا

بچے کا جبلی تقاضا ہے کہ وہ ہر چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے ۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ اشیاء کہاں سے آتی ہیں ، کیسے بنتی ہیں اور کون بناتا ہے ؟ معلومات کے یہ موضوعات روزمرہ استعمال کی اشیاء سے شروع ہو کر جدید ترین ایجادات و اختراعات تک وسیع ہو سکتے ہیں ۔ ترتیب و تنظیم اور تدریج کے ساتھ متعلم کو سائنسی معلومات فراہم کرنا تعلیم کا اہم فریضہ ہے ۔ کیونکہ یہ فرد کی تکمیل ذات سے براہ راست متعلق ہیں ۔

6 ۔ مہارتیں حاصل کرنا

مہارتوں کے حصول میں انسان کے اعضا کی تربیت شامل ہے ۔ مختلف متعلم اپنی خواہش کے مطابق مختلف اقسام کی مہارتیں مثلاً لکھنا ، پڑھنا ، دستی کام یا مشینی کام سیکھنا چاہتے ہیں ۔ معاشرے کو ان کی خواہش اور ضرورت کے مطابق ان مہارتوں کی تربیت کا بندوبست کرنا چاہیے ۔

7 ۔ کھیل کود اور دیگر مشاغل

کھیل کود بچے کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ دیگر تعلیمی سرگرمیاں ۔ دونوں میں توازن ضروری ہے ۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ بچے حصول تعلیم سے زیادہ کھیل کود میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس کے سدباب کے لیے عام تعلیم میں دلچسپی کے مواقع پیدا کرنے چاہئیں اور فارغ اوقات میں بچوں کو صحت مند اور دلچسپ مشاغل کی ترغیب دی جانی چاہیے ۔ یاد رہے کہ اگر کھیل کود اور مشاغل کو نظر انداز کر دیا جائے گا تو فرد کی ذات کی تکمیل نہیں ہو گی ۔

8 ۔ صحیح انداز فکر و اظہار و خیال

ہر فرد چیزوں اور واقعات وغیرہ کے متعلق اپنے ذہن میں کوئی بھی رائے قائم کرنے میں بالکل آزاد ہے اور اسی طرح وہ اظہار خیال کی بھی آزادی چاہتا ہے ۔ تعلیمی عمل کے ذریعے صحیح انداز فکر اور باسلیقہ اظہار خیال کی تربیت دی جانی چاہیے ۔

9 ۔ جمالیاتی حس کی تسکین

جمالیاتی حس ہر فرد میں پیدائشی طور پر ہوتی ہے ۔ بچہ ہو یا بڑا ، لڑکا ہو یا لڑکی وہ خوبصورتی کو پسند کرتا ہے اور اسے حاصل کرنے کی تمنا رکھتا ہے ۔ اگر بچپن ہی سے اس حس کی مناسب تربیت نہ کی جائے تو ایام جوانی میں انسان کے بھٹک جانے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس حس کی تسکین کے لیے بچے کو ابتدا ہی سے مناظر قدرت ، فنونِ لطیفہ وغیرہ سے لطف اندوز ہونے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں ۔

10 ۔ صحیح تصورِ کائنات

بچّے میں تجسس کی صفت فطرتاً پائی جاتی ہے ۔ لہٰذا ابتدا میں بچہ اپنے اردگرد کی اشیا کے بارے میں جاننا چاہتا ہے ۔ عمر کے اضافے کے ساتھ ساتھ جب تجربات میں بھی اضافہ

ہوتا ہے تو بچہ بیرونی یعنی دور کی چیزوں کو بھی سمجھنا چاہتا ہے ۔ حتیٰ کہ ایک مقام پر بچہ اپنی ذات ، کائنات اور نظامِ کائنات کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کرنے کی بھی خواہش کرتا ہے ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے تعلیم بچے کی مناسب رہنمائی کر سکتی ہے ۔

یہ وہ بنیادی ضروریات ہیں جن کو تعلیمی عمل میں ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہیئے اور تعلیمی مواد بچے کی عمر ، فہم و فراست اور تعلیمی مدارج کے مطابق بنانا چاہیے تاکہ اس کی بنیادی ضروریات کی خاطر خواہ تکمیل ہو سکے ۔

مشقی سوالات

(1) تعلیم کا مفہوم بیان کیجیے ۔

(2) تعلیم ایک ایسا عمل ہے جو ایک صحت مند معاشرے کی تنظیم کا کام انجام دیتا ہے ۔ بحث کیجیے ۔

(3) مختلف مفکرین کی آرا کی روشنی میں تعلیم کا مفہوم بیان کیجیے ۔

(4) تعلیم کے بنیادی عناصر کون کون سے ہیں ؟ سب سے اہم عنصر پر نوٹ لکھیے ۔

(5) تعلیم کے بنیادی وظائف بیان کیجیے ۔

(6) تہذیب و ثقافت کی تعمیر نو میں تعلیم کے کردار پر مفصل نوٹ لکھیے ۔

(7) تعلیم ، متعلم اور معاشرے کے باہمی تعلق کی وضاحت کیجیے ۔

(8) تعلم سے کیا مراد ہے ؟ مثالیں دے کر وضاحت کیجیے ۔

(9) فرد کی بنیادی ضروریات کی تشکیل میں تعلیم کے کردار پر مختصر نوٹ لکھیے ۔

(10) ذیل میں دیے گئے بیانات میں سے کچھ صحیح ہیں اور کچھ غلط ۔ اگر بیان صحیح ہے تو "ص" کے گرد اور اگر غلط ہے تو "غ" کے گرد دائرہ لگائیے ۔

i	تعلیم فرد کی تربیت کرنے اور اسکی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا نام ہے ۔	ص غ
ii	تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے جس کا مقصد معاشرتی تسویہ ہے ۔	ص غ
iii	عمل تعلیم صرف تعلیمی اداروں ہی سے وابستہ ہے ۔	ص غ
iv	رسمی اور غیر رسمی تعلیم میں تعلیم کے بنیادی عناصر الگ الگ ہوتے ہیں ۔	ص غ

v تعلیم کا سب سے اہم عنصر تعلیمی اداروں کا قیام ہے ۔ ص غ

vi تعلیم فرد کی عادات و خصائل میں تبدیلی کا نام ہے ۔ ص غ

vii طلبہ کو تمام مضامین ایک ہی طریقۂ تدریس سے نہیں پڑھائے جا سکتے ۔ ص غ

viii ایک ہی جیسے حالات مین طلبہ کے تعلم کی حیثیت عموماً یکساں ہوتی ہے ۔ ص غ

ix پیشۂ تدریس سے وابستگی کے لیے طبعی رجحان ضروری ہے ۔ ص غ

(11) ذیل میں دیے گئے نامکمل فقرات کو مناسب لفظ/الفاظ لکھ کر مکمل کریں ۔

(أ) فرد کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کی مربوط نشو و نما کا عمل -------- کہلاتا ہے ۔

(ب) کسی واقعہ ، بات یا حادثے کے باعث رونما ہونے والے ردِ عمل کو -------- کہتے ہیں ۔

(ج) -------- ان تمام علوم و مشاغل کا مجموعہ ہے جو مدرسہ اپنے طلبہ کو فراہم کرتا ہے ۔

(د) تعلیمی مواد کو متعلم تک پہنچانے کا سب سے اہم ذریعہ -------- ہے ۔

(ہ) علامہ اقبال کے خیال میں معلم ایک صنعت کار ہے جس کی صنعت -------- ہے ۔

(و) بچے کی اوّلین درس گاہ -------- ہوتا ہے ۔

(ز) بچے کے اوّلین اساتذہ -------- ہوتے ہیں ۔

(ح) -------- سے مراد وہ عمل ہے جس کے ذریعے طلبہ کو تعلم کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے ۔

(12) ذیل میں ہر سوال کے چار چار ممکنہ جوابات دیے گئے ہیں جن میں سے صرف ایک جواب صحیح ہے ۔ آپ صحیح جواب کے نمبر کے گرد دائرہ لگائیں ۔

(1) بچّے کی تعلیم کا اوّلین مرکز ۔

(ا) معاشرہ (ب) مسجد (ج) بچّے کا گھر

(د) مدرسہ

(2) فرد کی تعلیم و تربیت درحقیقت ۔

(أ) اس کے علم میں اضافہ کا موجب ہے ۔

(ب) اس کے لیے ذریعۂ معاش ہے ۔

(ج) پورے معاشرے کی تربیت ہے ۔

(د) اب ج تینوں ۔

(3) تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ۔

(أ) ذاتی تسکین کا حصول ہے ۔

(ب) عادات و خصائل میں مثبت تبدیلی ۔

(ج) معلومات عامہ کا حصول ہے ۔

(د) حصول سند برائے ملازمت ہے ۔

دوسرا باب

اسلامی نقطہ نظر سے
تعلیم کی بنیادیں

کسی ملت یا معاشرے میں تعلیم کا تصور کیا ہے؟ اس کو جاننے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ زندگی کے بارے میں اس ملّت یا معاشرے کا نظریہ کیا ہے؟ کوئی تعلیمی نظام خلا میں تیار نہیں ہوتا بلکہ کوئی بھی قوم پہلے اپنا نظریۂ حیات طے کرتی ہے پھر اس کے مطابق اپنی نوخیز نسلوں کی تربیت کے لیے ایک نظامِ تعلیم تشکیل دیتی ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی تصورات تعلیم کے جائزے سے پہلے اسلامی نظریۂ حیات کے بنیادی تصورات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

اسلامی نظریۂ حیات

اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق یہ کائنات حقیقی وجود رکھتی ہے اور انسان کو اس کائنات میں ایک ذمہ دارانہ اہم مقام حاصل ہے۔ اس کائنات کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ وہی انسان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس کی حاکمیت اعلیٰ کو ماننا اور اس کی مرضی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا اس تصور کا واضح تقاضا ہے۔ اس سلسلے میں معیارِ عمل وہ تعلیمات ہیں جو آخری الہامی کتاب قرآن مجید اور آخری رسول کے اسوۂ حسنہ پر مشتمل ہے۔

اسلامی نظریۂ حیات دوسرے مذاہب کی طرح زندگی کو دین اور دُنیا کے دو خانوں میں تقسیم نہیں کرتا بلکہ دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اسلام زندگی کے تمام شعبوں کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی معاشرتی ہوں یا تمدنی، مادی ہوں یا روحانی، معاشی ہوں یا سیاسی اور ملکی ہوں یا بین الاقوامی۔ اسلامی نظریۂ حیات کا اصل

مدعا روئے زمین پر خدا کے حکم اور قانون کا نفاذ اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کو رضائے الٰہی کے تابع کرنا ہے ۔ زندگی کے تمام شعبوں کی طرح یہ تصور تعلیم کو بھی اپنے دائرہ کار میں شامل کرتا ہے اور اپنے مخصوص تقاضوں کے مطابق نظامِ تعلیم کی تشکیل کرتا ہے ۔

تعلیم کی تعریف

تعلیم کے مفہوم اور دائرہ کار کے متعلق عمومی نقطۂ نظر پہلے باب میں پیش کیا جا چکا ہے ۔ اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم افراد کی شخصیت کی اس انداز سے تعمیر و تشکیل کرتی ہے کہ اللہ کی سرزمین پر اللہ کی حاکمیت اعلیٰ اور نوع انسانی کی خلافت قائم ہو ۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ افراد معاشرہ کو اس طرح تیار کیا جائے کہ ان کے ذہنوں میں ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنی بندگی کا تصور راسخ ہو جائے اور دوسری طرف کائنات کی دوسری تمام قوتوں پر اللہ کی رضا کے مطابق حکمرانی کی صلاحیت پیدا ہو جائے ۔

مقاصدِ تعلیم

کسی بھی معاشرے میں مقاصد تعلیم متعین کرتے وقت معاشرے کی اقدار کو بنیاد بنایا جاتا ہے ۔ اسلامی معاشرے میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت کے عقیدے کو سب سے بڑی قدر کی حیثیت حاصل ہے ۔ اس اعتبار سے تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہو گا کہ افراد معاشرہ میں عبدیت کا شعور راسخ کیا جائے ۔ اس کے لیے ان میں معرفتِ نفس ، معرفتِ کائنات اور معرفتِ خدا کے اوصاف کی تشکیل ضروری ہو گی ۔ پھر ان کے نتیجے کے طور سے رضائے الٰہی کے حصول کو مقصدِ تعلیم کی حیثیت حاصل ہو گی ۔ اس مقصد کا تقاضا ہو گا کہ طلبہ میں اطاعتِ خدا و رسولؐ کا رویہ پیدا کیا جائے ، پھر اس غرض کے لیے فکر آخرت کی نشو و نما کو مقاصد تعلیم میں شامل کرنا ضروری ہو جائے گا ۔ ان تمام مقاصد کا مرکز و محور عقیدۂ توحید ہے ۔

مقاصدِ تعلیم کا دوسرا پہلو انسان کے منصبِ خلافت سے تعلق رکھتا ہے ۔ اسلامی نقطۂ نظر سے انسان دُنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے ۔ اس حوالے سے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے حاکمِ اعلیٰ یعنی اللہ تعالیٰ کا تابع فرمان ہو وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دُنیا پر حکمرانی کے قابل ہو ۔ تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہو گا کہ افراد معاشرہ کو قیادت عالم کے لیے تیار کرے ۔ اس لیے ضروری ہو گا کہ طلبہ میں کائنات کے وسائل اور قوتوں کا علم و شعور پیدا کیا جائے اور انھیں اللہ تعالیٰ کی سرزمین پر اس کی حاکمیت کے قیام کے لیے استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے ۔

تعلیم کی اہمیت

بنیادی طور پر اسلام تعلیم و تربیت کا ایک نظام ہے جس کی عمارت کی پہلی اینٹ "اقرا" ہے ۔ اقرا کے معنی ہیں "پڑھو" ہمارے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز اسی لفظ سے ہوا تھا ۔ یوں اسلام میں پڑھنا اور پڑھانا روزِ اول ہی سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے ۔

حصولِ علم اور اشاعتِ علم اسلام کا بنیادی تقاضا ہے ۔ اس کی منظم کوشش کا نام تعلیم ہے ۔ اسلام میں اس عمل کی عظمت کا اندازہ اس ارشادِ نبوی سے لگایا جا سکتا ہے کہ یا معلم بن جاؤ یا متعلم ، اور تیسری حالت اختیار نہ کرو ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ رسالت کا تذکرہ کرتے ہوئے واضح طور سے تعلیم کتاب اور تعلیمِ حکمت کو بھی آپؐ کے وظائف میں شامل فرمایا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی کئی حیثیتیں تھیں ۔ مثلاً حاکمِ وقت بھی تھے اور سالار لشکر بھی لیکن آپ نے جس حیثیت کا فخریہ اظہار کیا وہ یہ تھی کہ مجھے تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے ۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کی تعلیم و تدریس کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن کی تعلیم حاصل کرے اور پھر اس کی تعلیم دے ۔ آپ کے ارشادات میں طالب علم اور معلم دونوں کے لیے بڑی بشارتیں ہیں ۔ مثلاً یہ کہ طالب علم کے اوپر فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں اور معلم کے لیے کائنات کی ہر شے دعائے خیر کرتی ہے ۔

تعلیم کے لیے مناسب عمر

اسلام کے تصور تعلیم کی رُو سے علم کے حصول کے لیے کوئی عمر مقرر نہیں ایک مسلمان ساری عمر طالب علم رہتا ہے اور اسے گود سے گور تک علم کی طلب کرنی چاہیئے ۔ بہر حال علمی اعتبار سے عمر کے بعض دور تعلیم کے لیے زیادہ موزوں ہوتے ہیں ۔ مثلاً جوانی میں چونکہ جسم اور ذہن کی قوتیں جوان ہوتی ہیں لہٰذا یہ زمانہ تعلیمی لحاظ سے بہترین دور ہے ۔

اصول تعلیم:

تعلیم کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے ایسے رہنما اصول موجود ہیں جن کو اصول تعلیم کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے۔ اِن اصولوں میں سے چیدہ چیدہ زیر بحث لائے گئے ہیں۔

(1) نصاب:-

نصاب سے مراد علوم کا وہ مجموعہ ہوتا ہے جو کسی بھی تعلیمی نظام کے زیر اہتمام طلبہ کے لیے فراہم کر دیا جاتا ہے جس کے مطابق وہ تعلیم کی کوشش کرتا ہے ۔ مسلمانوں کے تعلیمی لٹریچر میں اس مفہوم کے لیے منہاج کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے ۔ منہاج کے لفظی معنے راستے کے ہیں اور اس اعتبار سے یہ بہت حد تک انگریزی اصطلاح کری کلم (Curriculum) کا ہم معنی ہے ۔ گویا نصاب ایک شاہراہ ہے جس پر چل کر طالب علم منزلِ مقصود پر پہنچ سکتا ہے ۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کا مقصد مسلمانوں کو خلافت ارضی کے لیے تیار کرنا ہے ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے پورا علمِ کائنات جسے آج کی اصطلاح میں "سائنس" کہتے ہیں اسلامی نصاب میں شامل ہو جاتا ہے ۔ خلافت ارضی کا بنیادی تقاضا عبدیت کی تربیت ہے ۔ لہٰذا اسلامی عقائد و عبادات اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت مطلق کے رویے کی تشکیل کے لیے موزوں تصورات اور فعالیتیں نصاب میں شامل ہو جاتی ہیں ۔ پھر ہنر اور پیشے بھی انتخابی مضامین کی شکل میں نصاب میں شامل ہو جاتے ہیں ۔

مذکورہ بالا اصول کو سامنے رکھ کر مسلمان مفکرین نے نصاب کے مختلف خاکے تشکیل

دیے ہیں ۔ بالعموم ان تمام خاکوں کی روح ایک ہی ہے محض جزئیات میں اختلاف ہے ۔ مثال کے طور پر امام غزالی کے تشکیل کردہ نصاب کا خاکہ یہاں پیش کیا جاتا ہے ۔

امام غزالی نے دنیاوی علم کو تین قسموں کے تحت نصاب میں شامل کیا ہے ۔ پہلی قسم کو انہوں نے علم الاصول یعنی بنیادی علوم کا نام دیا ہے ۔ اس قسم میں ان علوم و فنون کو شامل کیا گیا ہے جن کے بغیر انسانی زندگی قائم ہی نہیں رہ سکتی مثلاً زراعت ، کپڑا بننا ، معماری اور سیاست ۔ دوسری قسم کو ''معاونات'' کا نام دیا گیا ہے اور اس میں ایسے فنون کو شامل کیا گیا ہے جو قسم اول میں شامل علوم کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مثلاً دھات کاری اور چوب کاری۔ تیسری قسم کو متممات یعنی تکمیلی فنون کا نام دیا گیا ہے۔ یہ فنون علم الاصول کی تکمیل کا ذریعہ ہیں مثلاً پیسنا' پکانا' سینا اور دھونا۔

دنیاوی علوم کی طرح امام غزالی نے دینی علوم کی بھی درجہ بندی کی ہے اور انہیں چار قسموں میں تقسیم کیا ہے ۔ اوّل علم الاصول یعنی بنیادی علوم جن میں قرآن ، حدیث اور اجماع شامل ہیں ۔ دوم علم الفروع یعنی ذیلی علوم جیسے علم وراثت ، حقائق اشیاء کا علم ، اخلاقیات ۔ سوم ''علومِ آلیہ یا معاون علوم'' جو پہلی دو قسموں کے علوم کے سمجھنے میں آلۂ کار ثابت ہوتے ہیں ۔ زبان و ادب اور اس سے متعلق مضامین اس زمرے میں شامل کیے گئے ہیں ۔ چوتھی قسم کو متممات یعنی تکمیلی علوم کا نام دیا گیا ہے اور اس میں قرأت و تفسیر اور علم اسما الرجال کو شامل کیا گیا ہے ۔

امام غزالی کے تجویز کردہ اس نصابی خاکے سے اسلامی نصاب کی جامعیت اور وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

(2) اوصافِ معلم

معلم کے لیے بہت سی صفات لازم ہیں ۔ معلم کو چاہیے کہ وہ علم کو طمع ، بدنیتی ، دوسروں پر دنیاوی فوقیت قائم کرنے اور مال یا اقتدار کی خاطر حاصل نہ کرے ۔ تواضع کے ساتھ ساتھ اپنے اور علم کے وقار کا ہمیشہ خیال رکھے ۔ کسی کے در پر پڑھانے کے لیے

نہ جائے ۔ البتہ بغرض اصلاح کسی کے ہاں جانے میں کوئی حرج نہیں ۔ حتی الامکان شک و شبہ کے مواقع سے اپنی ذات کو محفوظ رکھے ۔ لوگوں کے ساتھ عمدہ اخلاق ، خندہ پیشانی ، ضبط عمل ، مہمان نوازی ، عدل و انصاف ، ایثار و خدمت اور احسان شناسی سے پیش آئے ۔ اپنے ظاہر و باطن کو برے اخلاق سے پاک رکھے ۔ وقت کی پابندی کرے اور سوائے علمی مشاغل کے اپنے اوقات کو کسی دوسرے کام میں صرف نہ کرے ۔

(3) آدابِ تدریس

استاد کو چاہیے کہ تدریس کے دوران اپنی جگہ سے بلا ضرورت ادھر اُدھر حرکت نہ کرے ۔ ہاتھوں کو عبث کام میں نہ لگائے اور نہ انگلیوں میں انگلیاں ڈالے ۔ بلا ضرورت ارد گرد آنکھیں نہ گھمائے۔ طلبہ سے زیادہ ہنسی مذاق نہ کرے۔ بھوک' پیاس' غم و غصہ' نیند' پریشانی ، سخت سردی اور سخت گرمی کے اوقات میں درس نہ دے ۔ طلبہ کی استعداد کے مطابق درس دے ۔ درس کو اس قدر طول نہ دے کہ طلبہ اکتا جائیں اور ایسا مختصر بھی نہ کرے کہ طلبہ سمجھ ہی نہ سکیں ۔

استاد کو چاہیے کہ طلبہ سے عزت و احترام سے پیش آئے ۔ ان کی بہتری کا خیال رکھے ۔ اگر کسی طالب علم سے کبھی گستاخی سرزد ہو جائے تو صبر سے کام لے اور نرمی سے سمجھا دے ۔ مسائل کے بیان میں جہاں تک ہو سکے مثالوں سے وضاحت کرے ۔ اگر کوئی شاگرد سوال کرے تو اس کی طرف خاص توجہ دے ۔

استاد کو چاہیے کہ تمام طلبہ کے عادات و اطوار پر نگاہ رکھے ۔ لیکن ان کے عیوب پر پردہ ڈالے اور علیحدگی میں انھیں ان سے مطلع کرے ۔ وقتِ ضرورت طلبہ کی مدد کرے ۔ اگر کوئی طالب علم غیر حاضر ہو تو اس کے بارے میں معلومات حاصل کرے ۔ اگر وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے اور غمگین ہو تو اس کی دلداری کرے ۔ اگر ضرورت مند ہو تو حسبِ استطاعت مالی امداد کرے ۔

معلم کو چاہیے کہ آواز کو زائد بلند نہ کرے نہ انتہائی پست کہ جس سے مکمل فائدہ نہ ہو سکے ۔ اگر کوئی طالب علم کم سننے والا ہو تو حسب ضرورت آواز کو بلند کیا جا سکتا ہے ۔ تیزی کے ساتھ بیان نہ کرے بلکہ آہستہ آہستہ بیان کو جاری رکھے ، تاکہ سمجھنے والے کو سہولت ہو ۔ بوقت ضرورت تین مرتبہ بھی کسی ایک بات کا اعادہ کر سکتا ہے ۔ غلط الفاظ بولنے اور غیر متعلقہ بحثیں چھیڑنے سے پرہیز کرے ۔

(4) سزا اور انعام

اسلام میں تعلیم کی اصل بنیاد طالب علم کے ساتھ مشفقانہ سلوک پر ہے ۔ چنانچہ ناگزیر صورتوں کے سوا اسلامی تصورِ تعلیم میں سزا کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ حتی الامکان طالب علم کی حوصلہ افزائی کے لیے تحسین و انعام کا تصور ملتا ہے ۔ ہاں ناگزیر ہو جائے تو انتہائی احتیاط کے ساتھ حسبِ ضرورت بدنی سزا دی جا سکتی ہے ۔ اس سلسلے میں امام غزالی کی رائے میں پہلے مرحلے پر طالب علم کو علیحدگی میں سرزنش کی جانی چاہیے ۔ پھر ضرورت پڑے تو اس کے ساتھیوں کے سامنے اسے تنبیہہ کی جائے ۔ آخری صورت یہ ہے کہ طالب علم کو چھڑی سے زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ ضرب لگائی جائے ۔

(5) آداب متعلمین

اسلامی تصورِ تعلیم کی رو سے متعلمین کے لیے حسبِ ذیل آداب ضروری ہیں:

آدابِ تعلم :

طالب علم کو چاہیے کہ وہ بُرے عقائد ، بُرے اخلاق اور بُرے اعمال سے پرہیز کرے ۔ تعلیم کے لیے ایک ٹائم ٹیبل بنائے ۔ حفظ کے لیے وقتِ سحر کا اور بحث و مباحثہ کے لیے صُبح کا وقت زیادہ موزوں ہے ۔ کتابت کے لیے دوپہر کا وقت اور مطالعہ کے لیے رات کا وقت زیادہ مناسب ہے ۔

اساتذہ سے متعلق آداب :

طالب علم کو چاہیے کہ استاد کا احترام و اتباع کرے اور اس کے سامنے عاجزی اور تواضع سے پیش آئے ۔ اگر استاد تنہا بیٹھا مطالعے یا تصنیف و تالیف میں مشغول ہو تو اٹھ کر چلا آئے ۔ استاد ٹھہرائے تو ٹھہر جائے ۔ اسباق میں باقاعدگی سے حاضر رہے ۔ اس کے علاوہ بھی استاد کی مجلس میں آتا جاتا رہے ۔ مشکلات کی صورت میں استاد سے سوال کرنے میں شرم محسوس نہ کرے ۔

ذرائع علم

اسلامی نقطۂ نظر سے علم کے مختلف ذرائع حسب ذیل ہیں :

(1) حواس :

ہمارے ذخیرۂ علم کا ایک بہت بڑا حصہ حواس سے حاصل ہوتا ہے ۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے پورے علم کا انحصار تجربے اور مشاہدے ہی پر ہے ۔ اسلام بھی اس ذریعے کی افادیت کا قائل ہے ۔ چنانچہ قرآن حکیم میں جا بجا زمین پر چل پھر کر دیکھنے اور کائنات کا مشاہدہ کرنے پر زور دیا گیا ہے ۔ لیکن اسلام یہ حقیقت بھی واضح کرتا ہے کہ حواس کا دائرہ محض مادی دنیا تک محدود ہوتا ہے اور اس میدان میں بھی اس کی رسائی بڑی محدود ہوتی ہے ۔ حتیٰ کہ طاقتور قسم کے آلات کی مدد کے باوجود بھی ہم اپنے حواس کے ذریعے اس مادی کائنات کے ابھی بہت ہی تھوڑے سے حصے کا ادراک کر سکے ہیں ۔ جہاں تک مادی کائنات سے پرے کی دنیا کا تعلق ہے ان کے ادراک سے تو ہمارے حواس قطعی طور پر عاجز ہیں ۔

(2) عقل

انسانی عقل بھی علم کا ایک اہم ذریعہ ہے ۔ حواسِ خمسہ کی طرح عقلی استدلال اور غور و فکر کے نتائج کی صحت بھی قطعی نہیں بلکہ امکانی ہوتی ہے یعنی یہ نتائج درست بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی ۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ عقلِ انسانی جن حقائق سے نتائج اخذ کرتی

ہے وہ حواس کے ذریعے سے حاصل ہوتے ہیں اور حواس کی نارسائی کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں ۔ اس کے علاوہ عقل خود بھی ٹھوکر کھا سکتی ہے اور دستیاب حقائق سے غلط نتیجہ اخذ کر سکتی ہے ۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ موجودات کی ایسی صورتیں بھی پائی جاتی ہیں جو عقل کی رسائی سے بہت پرے ہیں ۔ مثلاً خدا ، فرشتوں اور جنت و دوزخ کا ادراک عقل سے نہیں کیا جا سکتا ۔ عقل کی اس نارسائی کے باوحود عقل ایک مفید ذریعہ علم ہے ۔ اسے تعصبات سے بالاتر ہو کر صحیح حقائق پر غور و فکر کے لیے استعمال کیا جائے تو صحیح نتائج پر پہنچنے کے امکانات واضح ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ اسلام نے اس ذریعۂ علم کو مفید قرار دیا ہے اور قرآن حکیم میں بار بار کائنات اور اس کے مظاہر کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے ۔

(3) اسناد

ہمارے علم میں ایک عنصر ایسے تصورات کا ہے جن کی سند کے طور سے آباو اجداد کی روایات اور تجربات کا حوالہ دینے پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔ اس قسم کا اسنادی علم بعض اوقات عقلِ سلیم سے ہم آہنگ ہوتا ہے ۔ لیکن کبھی اس میں عجیب و غریب قسم کی باتیں سامنے آتی ہیں ۔ جیسے یہ کہ منگل کے دن سفر منحوس ہوتا ہے یا یہ کہ 3 ، 13، 23 اور 8 ، 18، 28 کی تاریخیں نحس ہوتی ہیں ۔ غرض اسنادی علم میں صحت اور غلطی دونوں کا امکان ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس ذریعہ تعلیم کو بالکل رد تو نہیں کیا لیکن محض آباو اجداد کے طرزِ عمل یا روایت کی سند پر کسی تصور یا عمل کی صحت پر اصرار کی سخت مذمت کی ہے ۔ اسلام نے مشروط طور پر اس ذریعہ سے حاصل ہونے والے علم کو قابلِ قبول قرار دیا ہے ۔ قرآن کی رو سے وہ شرط یہ ہے کہ یہ علم عقلِ سلیم اور ہدایتِ الٰہی کے معیاروں پر پورا اترتا ہو ۔

(4) وجدان

جب کوئی علم اچانک آدمی کے تحت الشعور سے اس کے شعور میں آ جائے تو اسے "وجدان" کہتے ہیں ۔ دراصل انسان کا تحت الشعور ایک سٹور کی طرح ہے جہاں ماضی کے مشاہدات و تجربات گم گشتہ حالت میں پڑے رہتے ہیں ۔ یہ حواسِ خمسہ ، عقل ، غور و فکر ، وجدان یا وحی اور الہام سے ماخوذ ہو سکتے ہیں ۔ یوں اس سٹور میں صحیح اور غلط دونوں قسم کے علمی ذخیروں کا ایک ملغوبہ سا ہوتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس میں سے جو کچھ شعور کی سطح پر

وارد ہو گا وہ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی ۔ لہٰذا اس ذریعہ علم کی صحت بھی قطعی نہیں بلکہ امکانی رہ جاتی ہے ۔

(5) القائے ربانی

اہلِ فلسفہ میں سے ایک بڑی جماعت نے القائے ربانی کو ذریعہ علم تسلیم کیا ہے ۔ اس سے مراد اللہ کی طرف سے بندے کی طرف علم کی منتقلی ہے ۔ اللہ تعالیٰ علم کا سرچشمہ ہے اور خطا سے پاک ذات ہے ، لہٰذا القائی علم بذاتِ خود بالکل صحیح ہوتا ہے ۔ اسلامی نقطہ نظر سے اس علم کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔ ایک علم وحی ہے جس میں علم کا القا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کی طرف ہوتا ہے ۔ دوسری قسم الہام ہے ۔ اس میں بھی علم کا القا تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے لیکن علم کا وصول کنندہ غیر نبی ہوتا ہے ۔ اسلام صرف پہلی قسم کے علم یعنی علم وحی کو قطعی اور حتمی قرار دیتا ہے کیونکہ نبی خطا سے معصوم ہوتا ہے اور اللہ کی طرف سے القا کیے گئے علم کی ایسی تعبیر اور تبلیغ کرتا ہے جو منشائے الٰہی کے مطابق ہوتی ہے ۔ دوسری طرف الہامی علم میں صاحب الہام جو کہ غیر نبی ہوتا ہے جس سے خطا کا ارتکاب ممکن ہوتا ہے لہٰذا عین ممکن ہے کہ وہ اپنے الہام کی تعبیر یا تبلیغ میں غلطی کر جائے ۔ اس اعتبار سے الہامی علم کی صحت امکانی ہوتی ہے قطعی نہیں ۔

اوپر کی بحث سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے صرف ایک ذریعہ علم یعنی علم وحی کی صحت قطعی اور حتمی ہے اور باقی تمام ذرائع علم کی صحت امکانی ہے ۔ اسلام دیگر ذرائع میں سے کسی بھی ذریعے کو کلی طور سے مسترد نہیں کرتا ۔ البتہ وہ ان تمام ذرائع کو وحی الٰہی کے تابع کر دیتا ہے۔ ان میں سے کسی بھی ذریعے سے حاصل ہونے والا علم جہاں کہیں بھی وحی الٰہی سے ٹکرائے گا وہیں اس کو مسترد کرنا لازم ہو جائے گا ۔ جہاں وہ علم وحی سے ہم آہنگ ہو گا وہ پورے احترام کا مستحق ہو گا اور جو باقی ہو گا اس کی صحت کو امکانی قرار دیا جائے گا ۔

مشقی سوالات

(1) اسلامی نظریۂ حیات سے کیا مراد ہے؟ مسلمان بچوں کی تعلم و تربیت کے لیے اس کی کیا اہمیت ہے؟

(2) اسلامی تصورِ تعلیم کی رو سے مقاصدِ تعلیم اور تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

(3) نصابِ تعلیم سے کیا مراد ہے؟ اسلامی نقطۂ نظر سے اس کے خدوخال متعین کیجیے۔ اس سلسلے میں امام غزالی کے تصورات کا حوالہ دیجئے۔

(4) اوصافِ معلم پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔

(5) اسلامی نقطۂ نظر سے آدابِ تدریس کیا ہیں؟

(6) درج ذیل پر نوٹ لکھیے۔

(الف) سزا اور انعام۔

(ب) آدابِ متعلمین۔

(7) ذرائع علم سے کیا مراد ہے؟ اسلامی نقطۂ نظر سے کون کون سے ذرائع علم کس قدر معتبر ہیں؟۔

(8) مختصر جواب دیجیے۔

- اسلامی تصورِ تعلیم کی رو سے معلم کے پانچ اوصاف لکھیے۔
- تدریس کے پانچ آداب مختصر طور پر بیان کیجیے۔

(9) درج ذیل بیانات میں سے جو صحیح ہیں ان کے سامنے 'ص' اور جو غلط ہیں ان کے سامنے 'غ' کے گرد دائرہ ڈالیے۔

i ۔ اسلامی نظریۂ حیات زندگی کو دین اور دنیا کے دو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ص غ

ii ۔ اسلام کے تصورِ تعلیم کی رو سے تعلیم کے حصول کے لیے کوئی عمر مقرر نہیں۔ ص غ

(iii) طالب علم کو پیٹ بھر کر کھانا کھانا چاہیے کیونکہ کم خوری سے پیاس زیادہ لگتی ہے اور نیند آتی ہے۔ ص غ

(iv) اسلام تجربہ و مشاہدہ کو بہترین ذریعۂ تعلیم قرار دیتا ہے۔ ص غ

(v) اسنادی علم بعض اوقات عقلِ سلیم سے ہم آہنگ محسوس ہوتا ہے لیکن بعض اوقات اس میں عجیب و غریب قسم کی مضحکہ خیز باتیں سامنے آتی ہیں ص غ

(10) صحیح ترین جواب پر (✔) نشان لگائیے۔

اسلامی تصورِ تعلیم کی رو سے علم حاصل کرنے کا بہترین زمانہ کونسا ہے۔

(i) بچپن (ii) عالمِ شباب (iii) بڑھاپا

حفظ کے لیے بہترین وقت کونسا ہے؟

(i) سحر (ii) دوپہر (iii) عشا

اسنادی علم کی کیا حیثیت ہے؟

(i) صحیح ہوتا ہے (ii) غلط ہوتا ہے۔

(iii) صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی

اسلام کے نزدیک صرف ایک ذریعہ علم کی صحت قطعی ہے۔۔

(i) اسناد (ii) وحی (iii) اسناد اور وحی دونوں

(11) درج ذیل میں خالی جگہ کو پُر کیجیے۔

(i) مسلمانوں کے تعلیمی لٹریچر میں نصاب کے لیے --------- کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

(ii) تعلیم کا مقصد مسلمانوں کو --------- کے لیے تیار کرنا ہے۔

(iii) اسلام میں تعلیم کا بنیادی مقصد افرادِ معاشرہ میں .... کا

iv امام غزالی کے نزدیک سزا کی آخری صورت یہ ہے کہ طالب علم کو زیادہ سے زیادہ ---------- چھڑیاں لگائی جائیں ۔

v دراصل حواس کا دائرہ کار محض ---------- تک محدود ہوتا ہے ۔

vi جب کوئی علم اچانک آدمی کے تحت الشعور سے اس کے شعور میں آجائے تو اسے ---------- کہتے ہیں ۔

vii اسلامی نقطۂ نظر سے القائے ربانی کی رو سے علم کی دو قسمیں ہیں ایک وحی اور دوسری ---------- ۔

تیسرا باب

تعلیم کی فلسفیانہ بنیادیں

فلسفہ تعلیم کی انتہائی اہم بنیاد ہے ۔ یہ عام طور سے مسلّم ہے کہ تعلیم معاشرے کے فلسفۂ حیات کے تابع ہوتی ہے ۔ فلسفہ جہاں زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق تصورات و افکار فراہم کرتا ہے وہاں نظامِ تعلیم کے لیے بھی فکری بنیاد فلسفے ہی سے حاصل ہوتی ہے اور پھر نظامِ تعلیم کے تمام پہلو یعنی تعینِ مقاصد ، تشکیلِ نصاب ، حکمتِ تدریس اور انتظامات اس فکر سے متاثر ہوتے ہیں ۔ فلسفے کی اس تعلیمی اہمیت کو سمجھنے کے لیے فلسفے کا مفہوم اور دائرۂ کار سمجھنا بڑا ضروری ہے ۔

فلسفہ کیا ہے؟

عمومی مفہوم میں فلسفہ زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر کا نام ہے اور اصطلاحی معنوں میں اس سے مراد وہ کاوش ہے جس میں عقلِ انسانی کے ذریعے حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ فلسفے کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے دو باتوں کو ہمیشہ ذہن نشین رکھنا چاہیے ۔ اول یہ کہ فلسفے کا طریق مطالعہ عقلی غور و فکر پر مشتمل ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کا موضوع مطالعہ جزوی یا ظاہری حقائق نہیں بلکہ انتہائی ، کلی اور اصلی حقیقت ہوتا ہے ۔ حقیقت اصلیہ اور حقیقت ظاہریہ کے فرق کو سمجھنے کے لیے ذرا اس امر کو ذہن میں رکھیں کہ بظاہر انسان کا وجود حقیقی ہے لیکن ذرا غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا یہ وجود کائنات میں پھیلے ہوئے بے شمار وسائل اور اسباب پر منحصر ہے اور مزید غور کریں تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ وسیع کائنات بھی از خود قائم نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اسے قائم رکھے ہوئے ہے اور اس کا نظام چلا رہا ہے ۔ اس حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ انسان اور کائنات کے وجود کو حقیقت ظاہریہ کی حیثیت حاصل ہے جب کہ اللہ تعالیٰ جو انسان اور کائنات کے وجود کو قائم رکھے ہوئے ہے ۔ حقیقت اصلیہ ہے ۔ گویا حقیقت اصلیہ ایسے وجود کو کہیں گے جو از خود قائم ہو اور باقی تمام موجودات اپنے وجود کے لیے اس کے محتاج ہوں ۔

فلسفے کا دائرۂ عمل

فلسفے کے مفہوم سے اس کے دائرہ عمل کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ آج سائنس کا دور ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ سائنس کے کارنامے عظیم ہیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ سائنس کا دائرہ کار طبعی دنیا سے آگے نہیں بڑھ سکتا ۔ حقیقت اصلیہ کے ادراک سے وہ عاجز ہے ۔ یہ مذہب کا امتیاز ہے یا فلسفے کا کہ وہ اس مادی کائنات سے آگے بڑھ کر عالم حقیقی کے ادراک کو اور کائنات ہی نہیں خالق کائنات کی معرفت کو بھی اپنا نصب العین بناتے ہیں ۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے علوم حقیقت کے مختلف اجزا کو جدا جدا جاننے تک محدود ہیں اور حقیقت کے ظاہری روپ کے ادراک پر اکتفا کر لیتے ہیں جب کہ فلسفہ حقیقت کو اس کے اصل روپ میں اور اس کی مجموعی حیثیت میں جاننا چاہتا ہے ۔

انسانی زندگی کا ایک اور میدان ایسا ہے جہاں ایک دفعہ پھر فلسفہ ہی انسان کی تسکین کے لیے آگے بڑھتا ہے ۔ یہ اخلاقیات کا میدان ہے ۔ اس کا موضوع یہ ہے کہ انسان کے لیے کیا خیر ہے کیا شر؟ کیا جائز ہے کیا ناجائز؟ ان سوالات کا دائرہ اشیاء کے استعمال سے لیکر رویوں ، جذبوں اور روابط تک پھیلا ہوا ہے اور انسان روز مرہ زندگی میں مسلسل ان کا سامنا کرتا رہتا ہے ۔ سائنس ان سوالوں کا جواب دینے کا سرے سے کوئی دعویٰ ہی نہیں کرتی ۔ یہ فلسفے کا میدان ہے ۔ اصطلاحاً فلسفے کے اس شعبے کو قدریات کا نام دیا جاتا ہے ۔

معاملہ اخلاقیات کا ہو یا حقیقتِ اصلیہ کے ادراک کا یا وجودیات کا ۔ ہر سنجیدہ شخص کے ذہن میں بہر حال یہ سوال ابھرتا ہے کہ کسی وجود کے برحق ہونے یا کسی قدر کے مطلوب ہونے کا ہمارے پاس آخر کیا معیار ہے؟ یہ علمی معیار فلسفے کے مطالعہ سے ہاتھ آتا ہے ۔ کیوں کہ مطالعۂ فلسفہ کا ایک اہم پہلو علم کی حقیقت سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس سلسلے میں فلسفہ ہمیں بتاتا ہے کہ علم کے ذرائع کون کون سے ہیں اور ان سے حاصل ہونے والا علم کس قدر قابل اعتماد ہے ۔ اس موضوع پر مفصل بحث گزشتہ باب میں گزر چکی ہے ۔

اوپر کی بحث کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفہ کا دائرہ عمل زندگی کے بنیادی تصورات و افکار کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ فلسفہ گویا نظریۂ حیات کا دوسرا نام ہے اور یہ امر واضح ہے کہ نظریۂ حیات ہی بالآخر طرز حیات کی بنیاد بنا کرتا ہے ۔

فلسفے اور تعلیم کا باہمی تعلق

فلسفے اور تعلیم کا باہمی تعلق سمجھنے کے لیے فلسفے اور تعلیم دونوں کے مفہوم سے مدد لی جا سکتی ہے ۔ فلسفے کا مفہوم اوپر کی بحث سے واضح ہو جاتا ہے ۔ تعلیم کا مفہوم اس کتاب کے شروع ہی میں واضح کیا جا چکا ہے ۔ ذرا اس پر ایک دفعہ پھر نظر ڈال لیں کہ تعلیم کیا ہے ؟ فرد کی تکمیل ذات کا عمل ' فرد کے معاشرتی تسویے کا عمل یا ثقافتی ورثے کی منتقلی کا عمل ۔ انھیں تعلیم کے وظائف بھی کہا جا سکتا ہے ۔ بہر حال تعلیم حسن کمال (Excellence) کے حصول اور منتقلی کا عمل ہے ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "کمال" کیا ہے تو جواب یہی ہو گا کہ وہ سب کچھ جو پسندیدہ ہو ، خوبی و کمال کی حیثیت رکھتا ہے ، یوں تعلیم کی روح کی تلاش میں ہم فلسفے کے میدان میں جا پہنچتے ہیں کیوں کہ "کمال" کا تعین اسی کے ذریعے ہو سکتا ہے اور پھر نظام تعلیم کی بنیاد جن مقاصد پر ہوتی ہے ان کا تعین بھی اخلاقیات ہی کے حوالے سے ہوتا ہے جو فلسفے کا میدان ہے ۔

فلسفے اور تعلیم کے تعلق کا دوسرا اہم مظہر نصاب تعلیم ہے ۔ ایک تو اس لیے کہ نصاب مقاصد پر مبنی ہوتا ہے لہذا نصاب سازی کے عمل میں بھی فلسفہ اہم حیثیت حاصل کر لیتا ہے ۔ دوسرے زاویے سے لوازمۂ نصاب پر متعلقہ فلسفے کی واضح چھاپ نظر آئے گی ۔ اگر کوئی فلسفہ صرف حواس خمسہ ہی کو علم کا معتبر ذریعہ قرار دیتا ہے تو منطقی طور سے اس فلسفے کے تحت بننے والے نصاب میں حواسِ خمسہ کے ذریعے سے حاصل شدہ علم اور اس سے متعلق مضامین کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گی ۔ اس کے برعکس اگر وحی الٰہی کو علم کا معتبر سرچشمہ مان لیا جائے تو نتیجہ یہ ہو گا کہ لوازمۂ نصاب میں قران و سنت اور اس کے معاون علوم کو مرکزی حیثیت حاصل ہو جائیگی ۔

نظام تعلیم میں نصاب کے بعد حکمت تدریس بہت اہم ہے ۔ حکمتِ تدریس سے مراد وہ تمام عملی تدابیر اور وسائل ہیں جن کو استعمال کر کے لوازمۂ نصاب طلبہ تک پہنچایا جاتا ہے ۔ تعلیم کے اس پہلو میں بھی فلسفے کی حکمرانی واضح ہے ۔ اول تو اس لیے کہ حکمت تدریس لوازمہ نصاب کے تابع ہوتی ہے ۔ دوم اس لیے کہ تدریسی حکمتِ عملی میں اس امر کا

انحصار سراسر فلسفیانہ نقطۂ نظر پر ہو گا کہ معلم کو ذہن سازی کا انداز اختیار کرنا چاہیے یا علمی آزادی کا۔ علمی آزادی کے معنی یہ ہیں کہ اختلافی امور میں موافق و مخالف دونوں پہلو طالب علم پر واضح کر دیے جائیں اور ان میں سے کسی بھی پہلو کو رد یا قبول کرنے کا معاملہ اس پر چھوڑ دیا جائے۔ اس کے برعکس ذہن سازی کے انداز تدریس میں معاملے کا ایک خاص پہلو طالب علم کے ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ یوں فلسفیانہ انداز فکر کے نتیجے میں تدریسی طرز عمل میں واضح فرق واقع ہو جاتا ہے۔ مثلاً ترقی پسند فلسفہ علمی آزادی کو تدریسی حکمت عملی کا محور بنانے کا تقاضا کرے گا جبکہ روایت پسند فلسفہ ذہن سازی کا تقاضا کرے گا۔

اوپر کی بحث سے یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ فلسفہ، تعلیمی عمل پر اثرانداز ہوتا ہے، لیکن اس کے برعکس یہ بھی حقیقت ہے کہ تعلیم معاشرتی عمل کی حیثیت سے معاشرے کے فلسفۂ حیات کو متاثر کرتی ہے۔ تعلیم کے دائرہ کار میں یہ بات شامل ہے کہ یہ معاشرے کے فلسفۂ حیات اور ثقافتی ورثے کا تنقیدی جائزہ لے کر اس میں سے اچھے پہلوؤں کا انتخاب کرے انھیں نشوونما دے اور پھر اسے اگلی نسلوں کی طرف منتقل کرے۔ یوں ایک وقت آسکتا ہے کہ تعلیم معاشرے میں مروجہ نظریۂ حیات کو یکسر بدل کر رکھ دے۔ تاریخ میں اس امر کی ایک روشن مثال حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اسلامی نظام تعلیم کے نفاذ کی ہے جس کے نتیجے میں جزیرۃ العرب کے نظریۂ حیات اور تہذیب و تمدن میں واضح انقلاب آگیا تھا۔

فلسفۂ تعلیم کے اس مختصر تعارف کے بعد ذیل میں نمائندہ قسم کے تعلیمی فلسفوں کے نمایاں تصورات کا ایک جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ترقی پسندیت

ترقی عام فہم معنوں میں اصلاح اور بہتری کی طرف پیش قدمی کو کہتے ہیں۔ ان معنوں میں کون شخص یا کون سی قوم ترقی کو پسند نہیں کرے گی۔ چنانچہ ہمارے ہاں اکثر سادہ لوح اشخاص ترقی پسند کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تو یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ اسلام سب سے بڑھ کر ترقی پسند نظریۂ حیات ہے۔ لفظ ترقی کے لفظی معنوں کے

لحاظ سے تو یہ سب درست ہے لیکن فلسفیانہ اصطلاح کے اعتبار سے ترقی پسندیت مخصوص تصورات پر مشتمل تعلیمی فلسفہ ہے ۔ اس فلسفے کے بعض اطلاقی پہلو تو ضرور پرکشش ہیں لیکن اس کے بنیادی تصورات سراسر الحادی ہیں ۔

ذیل میں اس فلسفے کے نمایاں تصورات کا ایک جائزہ پیش کیا گیا ہے :

بنیادی تصورات :

جہاں تک علم کی حقیقت کا تعلق ہے ۔ اس فلسفے میں محض حواس خمسہ ہی کو علم کا معتبر ذریعہ قرار دیا جاتا ہے ۔ چنانچہ ترقی پسند فلسفی تجربہ و مشاہدہ اور عقل کے علاوہ کسی اور ذریعۂ علم کے قائل نہیں خواہ وہ وجدان ہو یا وحی یا الہام ہو ۔ اس طرح ترقی پسند فلسفے کی کل کائنات صرف سائنسی علوم ہیں جن کی بنیاد تجربہ و مشاہدہ اور تعقل پسندی پر ہے ۔

جہاں تک حقیقت اصلیہ کا تعلق ہے ، ترقی پسند منطقی طور سے مادی دنیا سے آگے کسی وجود کے قائل نہیں ہو سکتے ۔ ترقی پسندیت میں علم کا معتبر ذریعہ صرف حواس ہے ۔ لہذا اس فلسفے میں حواس سے پرے کے موجودات کے ادراک کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ۔ چنانچہ ترقی پسند غیر مادی تصورات اور عقائد کو کسی شمار میں نہیں لاتے ۔ گویا اس فلسفے میں خدا اور وحی الٰہی کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں اور اسی طرح جنت ، دوزخ ، آخرت اور فرشتوں کے وجود اور ان سے متعلق عقائد و تصورات کی بھی ترقی پسند فلسفے میں کوئی گنجائش نہیں ۔ اس فلسفے کے نزدیک مادی دنیا چونکہ ہر وقت تغیر پذیر ہے لہذا تغیر ہی اصل حقیقت ہے ۔

فلسفۂ ترقی پسندیت کسی پائیدار نظامِ اخلاق میں یقین نہیں رکھتا ۔ ترقی پسندوں کے نزدیک چونکہ حقیقت بذاتِ خود تغیر پذیر ہے لہذا ان کے نزدیک اخلاقی اقدار بھی بدلتی رہتی ہیں ۔ وقت ، علاقے ، حتیٰ کہ فرد کے بدلنے سے اقدار بدل جائیں گی ۔ یعنی کوئی چیز اگر ایک شخص کے نزدیک خیر ہے تو وہی چیز کسی دوسرے کے نزدیک شر قرار پا سکتی ہے ۔ آج کوئی چیز خیر ہے تو کل شر کی حیثیت حاصل کر سکتی ہے یا کوئی چیز پاکستان میں خیر ہے تو وہی چیز امریکہ ، روس یا مصر میں شر قرار پا سکتی ہے ۔ غرض کوئی اخلاقی معیار نہیں جس کی بنا پر ہم کسی شئے ، رویے یا تعلق کو اچھا یا برا ، جائز یا ناجائز قرار دے سکیں ۔

اسطرح ترقی پسندوں کے نزدیک مادی فوائد کو بنیادی قدر حاصل ہے اور اسی کی بنا پر خیروشر یا جائز و ناجائز کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑا ہی مصنوعی معیار ہے یعنی یہ معیار بذاتِ خود مختلف افراد میں مختلف ہو گا اور دوسری طرف زمان و مکان کے تغیر سے بھی متاثر ہو گا۔

تعلیمی تصورات:

تعلیمی تصورات میں مقاصدِ تعلیم کو اولیت حاصل ہے ۔ لیکن ترقی پسند اصولاً پہلے سے متعین مقاصدِ تعلیم کے قائل نہیں ہیں ۔ یہ ان کے اس تصور کا منطقی نتیجہ ہے کہ اقدار بدلتی رہتی ہیں ۔ مقاصد اقدار ہی پر مبنی ہوتے ہیں لہذا ظاہر ہے کہ ترقی پسند فلسفے کے تحت قائم ہونے والے نظامِ تعلیم میں مقاصد بھی بدلتے رہیں گے ۔

مقاصدِ تعلیم کے بعد نصابِ تعلیم کی باری آتی ہے ۔ ترقی پسند فلسفے میں مقاصد ہی مستقل بنیادوں پر متعین نہیں کیے جاتے لہذا نصاب کی تشکیل بھی پائیدار بنیادوں پر نہیں کی جاتی ۔ اصولاً یہ فلسفہ پہلے سے متعین نصابِ تعلیم کو تسلیم نہیں کرتا ۔ تمام طلبہ کے لیے یکساں نصاب کا کوئی تصور بھی اس فلسفے سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ ہر طالب علم کی پسند، ناپسند دلچسپیاں اور ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں ۔ چنانچہ اس فلسفے کا بنیادی تصور یہ ہے کہ معلم اور متعلم باہمی شرکت سے عملی تعلیمی صورتِ حال میں متعلقہ مقاصد کا تعین کریں ۔ مزید برآں اس فلسفے میں چونکہ حواس خمسہ ہی کو علم کا معتبر ذریعہ سمجھا جاتا ہے لہذا اس کے تحت تشکیل کردہ نصاب سراسر سائنسی علوم پر مشتمل ہو گا ۔ مذہبی علوم کو اس میں سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہو گی ۔

جہاں تک حکمتِ تدریس کا تعلق ہے ، ترقی پسندیت ایسے طریق تدریس پر زور دیتی ہے جن میں طلبہ کی براہِ راست شرکت کی نمایاں گنجائش ہو ۔ اس اعتبار سے طریقِ بحث ، منصوبی طریق ، تجرباتی طریق ، اکتشافی طریق اور تعلیمی سیر وغیرہ اچھے طریقے سمجھے جائیں گے ۔ تدریس کے ضمن میں طلبہ کے انفرادی اختلافات پر خاص زور دیا جاتا ہے اور ان کی دلچسپیوں

اور آمادگی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے ۔ ترقی پسندیت کا رہنما تدریسی اصول یہ ہے کہ بچے کو جب وہ چاہے اور جو وہ چاہے وہی پڑھائیں ۔

انتظامیات کے اعتبار سے ترقی پسندیت جمہوریت پسند فلسفہ ہے ۔ نظم و نسق میں جمہوری انداز اس کی نمایاں علامت ہے ۔ ڈسپلن یعنی ضبط کے سلسلے میں آزادانہ طرز عمل پر زور دیا جاتا ہے ۔ خارجی ضبط کے قواعد کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے ۔ خارجی ضبط سے پرہیز میں اصولاً اس حد تک مبالغہ کیا جاتا ہے کہ طلبہ کو توڑ پھوڑ تک سے روکنا بھی گوارا نہیں کیا جاتا ۔ تصور یہ ہے کہ تعلیم کو طلبہ میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے لہذا ان پر پابندیاں لگانا درست نہیں ۔

روایت پسندیت

روایت پسندیت کو عام طور پر ترقی پسندیت کی ضد سمجھا جاتا ہے ۔ چونکہ ترقی پسندیت ایک الحادی یعنی غیر مذہبی فلسفہ ہے لہذا اس کے مقابلے میں روایت پسندیت کو ایک مذہبی فلسفہ خیال کیا جاتا ہے ۔ یہ نقطۂ نظر درست نہیں ۔ اصل میں مذہبیت روایت پسندیت کا لازمہ نہیں ۔ روایت پسند فلسفہ مذہبی بھی ہو سکتا ہے اور غیر مذہبی بھی ۔ اس کی لازمی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آباو اجداد کی روایات کے حوالے سے کسی تصور کو قبول کرنے یا رد کرنے کا اختیار ہوتا ہے ۔

بنیادی تصورات :

روایت پسندیت کی وجہ تسمیہ اس کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں بزرگوں کی روایات کو سند کا درجہ دیا جاتا ہے ۔ کسی تصور ، عمل یا تعلق کے صحیح یا غلط قرار دینے کے لیے پرانے بزرگوں کی روایت کا حوالہ دیا جاتا ہے ۔ دیگر ذرائع علم جیسے حواس ، عقل ، وجدان کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی ۔ وحی و الہام کا تصور گو روایت پسندیت کے منافی نہیں لیکن عملاً روایت پسند ذہن بالآخر اس نقطے پر آ پہنچتا ہے کہ ہم تو وہی کچھ کریں گے جو کچھ ہم نے اپنے باپ دادا کو کرتے دیکھا ہے ۔

پرانی ڈگر پر چلنے پر اصرار روایت پسندیت کا خاصہ ہے ۔ لہٰذا اس فلسفہ کے حامی ترقی پسندیت کے اس تصور کے مخالف ہیں کہ تغیر ہی اصل حقیقت ہے ۔ ان کے نزدیک ثبات تغیر سے زیادہ حقیقی ہے ۔

اخلاقیاتی پہلو سے روایت پسند اقدار کے مستقل اور غیر متغیر ہونے کے قائل ہیں ۔ ان کے نزدیک زمان و مکان کے بدلنے سے اقدار میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ۔ مثلاً صداقت ایک پسندیدہ قدر کی حیثیت رکھتی ہے اور زمانے یا علاقے کے کسی تغیر سے اس کی اس حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔

تعلیمی تصورات :

روایت پسندیت میں چونکہ حقیقت اصلیہ اور اقدار کے غیر متغیر ہونے کا تصور پایا جاتا ہے ۔ لہٰذا اس فلسفے میں مستقل بنیادوں پر متعین مقاصد کو نظامِ تعلیم کی تشکیل کی بنیاد بنایا جاتا ہے ۔ یہ مقاصد ایسی اقدار کے حوالے سے متعین کیے جاتے ہیں جسے ثقافتی ورثے کی نسل در نسل روایت ، پسندیدہ قرار دے چکی ہو ۔ اس طرح طے شدہ مقاصد کی بنیاد پر نصابِ تعلیم بھی مستقل بنیادوں پر تشکیل دیا جاتا ہے ، جو پوری جماعت کے لیے مشترک ہوتا ہے ۔ اس میں تنوع کی بجائے یکسانیت پائی جاتی ہے ۔ یہ نصاب ایسے علوم و تجربات پر مشتمل ہوتا ہے جنھیں صحیح اور قابل قدر قرار دینے کی نسل در نسل روایت موجود ہو ۔ بعض بنیادی علوم کو نسل در نسل منظوری یا سند حاصل ہونے کی وجہ سے لازمی مضامین کا درجہ دیا جاتا ہے ۔ جیسے فلسفہ ، منطق ، ریاضی اور ادب ۔ بعض اوقات آباؤ اجداد کی قدیم روایت کی بنا پر بعض مضامین کی بعض مخصوص کتابوں کو سند کا درجہ دے دیا جاتا ہے ۔ ارسطو کی کتاب 'بوطیقا' اور افلاطون کی کتاب 'جمہوریہ' اس کی واضح مثالیں ہیں ۔

جہاں تک حکمتِ تدریس کا تعلق ہے ، روایت پسندیت میں نفسِ مضمون کی مہارت کو علم و فضل کا معیار قرار دیا جاتا ہے ۔ چنانچہ اس فلسفے کے تحت ایسے تدریسی طریقوں کو معتبر سمجھا جاتا ہے جن میں نفسِ مضون کی مہارت پر زور دیا گیا ہو ، مثلاً طریق تحریر ، طریق بحث ، طریق سوال و جواب ، طریق اعادہ وغیرہ ۔ اس فلسفے میں لوازمۂ نصاب کو طلبہ کی

ذہنی سطح سے مناسبت کو کوئی حیثیت نہیں دی جاتی ۔ طالب علم چاہے یا نہ چاہے اسے مقررہ نصاب پڑھنا پڑتا ہے ۔ روایت پسندیت کا واضح تصور یہ ہے کہ طالب علم ایک نوخیز ، نو آموز اور ناتجربہ کار فرد ہے جو خود اپنے نفع و نقصان کا صحیح شعور نہیں رکھتا ۔ یہ معلم ، معاشرے اور تعلیمی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ اسے مفید علم سے مزین کریں ۔ اس تصور کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ طریقِ تدریس میں متعلم کے بجائے معلم کو مرکزی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے ۔

روایت پسند فلسفے کے تحت انتظامیہ کا رویہ خاصہ آمرانہ ہوتا ہے محکمے میں ناظم تعلیمات ، مدرسے میں صدر مدرس اور کمرۂ جماعت میں معلم کو ایک حاکم و آمر کی حیثیت حاصل ہوتی ہے ۔ نظم و نسق اور ضبط طلبہ کے سلسلے میں سخت قسم کے قواعد و ضوابط استعمال کیے جاتے ہیں ۔ روایت پسندوں کی رائے میں پابندی قواعد ہی سے انسان میں وہ اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے جو اسے نفسانی خواہشات سے آزاد کر سکتی ہے ۔ طلبہ کے انفرادی اختلافات کو اس فلسفہ میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ۔ روایت پسندوں کا تصور ہے کہ نوع انسان کے مختلف افراد کا باہمی اختلاف سطحی اور ضمنی ہے اور ان میں بنیادی فطرت کو قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل ہے ۔ وہ تعلیم میں اسی قدرِ مشترک پر زور دینے کے قائل ہیں ۔

اسلامی نظریۂ حیات

اسلامی نظریۂ حیات ایسی قدیم روایات کا امین ہے جس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے ۔ ان روایات کا سلسلہ انسانِ اول حضرت آدم علیہ السلام سے ملتا ہے ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ان روایات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے ۔ اسلامی نظریۂ حیات کے اہم تصورات ذیل میں پیش کیے گئے ہیں ۔

دراصل اصطلاحی معنوں میں اسلام نہ تو روایت پسند فلسفہ ہے اور نہ ہی ترقی پسند ۔ اس کے بنیادی فلسفیانہ تصورات ان دونوں فلسفوں سے مختلف بلکہ ان دونوں فلسفوں کے تصورات میں اسلامی تصورات سے مشابہت نظر آ جاتی ہے ۔ اسلام بہر حال ان دونوں فلسفوں سے قدیم ہے اور اپنے رنگ و روپ کے لیے اسے ان میں سے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں ۔ ہاں اگر ان میں کہیں بھی کوئی خیر ہو تو اسلام کا دامن اس کے

لیے ہمیشہ کھلا ہے کیونکہ دنیا میں جہاں بھی کوئی خیر ہے وہ دراصل اسلام ہی کا فیض ہے ۔ جیسا کہ حدیثِ نبوی میں ارشاد ہوا ہے کہ حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے وہ جہاں کہیں بھی اسے پائے وہ اسکا سب سے زیادہ حقدار ہے ۔

اسلامی نظریۂ حیات کے اہم نکات ذیل میں پیش کیے گئے ہیں :

بنیادی تصورات :

اسلام علم و حکمت پر مبنی دین ہے ۔ یہ کسی بھی تصور ، نظریے ، عقیدے ، عمل یا تعلق کی صحت یا عدم صحت کے لیے علم ہی کو معیار قرار دیتا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی اس نے خود علم کی صحت کے لیے بھی یقینی معیار فراہم کیا ہے ۔ محض وہم و گمان ، خواب و خیال یا اندازوں اور سنی سنائی باتوں کو علم قرار دینے کی اسلام نے سختی سے مخالفت کی ہے ۔ آباؤ اجداد کی روایات کو صرف اس صورت میں قابل قبول قرار دیا ہے جب تک وہ ہدایت الٰہی اور عقلِ سلیم کے معیاروں پر پوری اترتی ہوں۔اسلام حواسِ خمسہ اور تجربہ و مشاہدہ کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کرتا ہے ۔ لیکن اس کے لیے متعلقہ شخص کے حواس کی درستی اور کردار کی پختگی دونوں کو ضروری قرار دیتا ہے ۔ اس شرط کے ساتھ بھی یہ علم بہرحال مادی دنیا تک محدود ہے ۔ اسی طرح دوسرے ذرائع علم مثلاً عقل اور وجدان کی صحت کو بھی اسلام امکانی قرار دیتا ہے اور علمِ حقیقی کے ساتھ مطابقت کو مشروط کرتا ہے ۔ علمِ حقیقی کا سرچشمہ اسلامی نقطۂ نظر سے وحی ہے اور یہی معتبر اور مستند علم ہے ۔ دوسرے ذرائع سے حاصل شدہ علم کی صحت کا دار و مدار اسی علم سے مطابقت پر منحصر ہے ۔

اسلامی تصورات میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو واجب الوجود کی حیثیت حاصل ہے ۔ یہی ذات بذاتِ خود قائم ہے اور باقی سب کائنات اسی کی مشیت سے قائم ہے ۔ انسان کائنات میں عظیم ترین شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے لیکن وہ خود اور اس کے وجود کے قیام کے تمام اسباب و علل اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع اور محتاج ہیں ۔ کائنات اور انسان اپنے وجود کی تمام تر مقصدیت اور اہمیت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے حضور عاجز محض ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ازلی و ابدی ہے اور اس کا وجود مستقل ہے ۔ وہی خالق ہے ، وہی مالک ہے ، آقا ہے ، حاکمِ اعلیٰ ہے ، وہی علم کا سرچشمہ ہے ، لہٰذا اسی کا زندگی اور کائنات کے ہر شعبہ میں قانون نافذ ہونا چاہیے ۔

اسلامی اخلاقیات کا سرچشمہ بھی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ۔ چنانچہ سب سے بڑی اور بنیادی قدر خود اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے اور پھر اسلام کا پورا نظام اقدار اس کی اساس پر تشکیل پاتا ہے ۔ عبادت کو اسی لیے ایک اعلیٰ قدر کی حیثیت حاصل ہے کہ اس کا مطمعٔ نظر انسان میں تسلیم و رضا کی خو پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ اخلاق حسنہ کی ایک لمبی فہرست ہے جسے اسلام مطلوب قرار دیتا ہے ۔ لیکن ان سب کی تہہ میں بنیادی قدر رضائے الٰہی کا ہونا ضروری ہے ۔

تعلیمی تصورات:

اسلامی نظریۂ حیات مستقل نظام اقدار کا مالک ہے ۔ لہٰذا اسلامی نظام تعلیم میں واضح طور سے متعین مقاصد ضروری ہیں ۔ چنانچہ اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کے اہم نصب العین ، رضائے الٰہی کا حصول ، نیابتِ الٰہی کا قیام اور تسخیرِ کائنات ہیں ۔ اسی حوالے سے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا حصول بھی تعلیم کا مقصد بن جاتا ہے معرفت نفس کو تعلیم کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور دنیا کی اشیاء کی ماہیت اور ان کا استعمال بھی مقاصدِ تعلیم میں شامل ہو جاتا ہے ۔ فکرِ آخرت کو رضائے الٰہی کے حصول میں ایک اہم محرک کی حیثیت حاصل ہے ۔ لہٰذا وہ بھی ایک اہم مقصدِ تعلیم ہے ۔ فلاح آخرت کے لیے ایمان ، تقویٰ اور احسان کی صفات بھی مقاصد کا حصہ بن جاتی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کے قیام کے لیے جدوجہد کی غرض سے تسخیرِ کائنات کو بھی مقصد تعلیم کا مقام حاصل ہو جاتا ہے ۔

تصور نصاب

اسلامی نقطۂ نظر سے نصاب کم و بیش مستقل بنیادوں پر تشکیل کیا جائے گا ۔ اسے تعلیم کے مستقل عمومی مقاصد کا موثر آلۂ کار ہونا چاہیے ۔ اس میں انفرادیت کے بجائے اجتماعیت کا رنگ غالب ہو گا ۔ اس میں علم وحی کو مرکزی اور لازمی حیثیت حاصل ہو گی ۔ معرفت نفس اور تسخیر کائنات کے مقاصد کے حصول کے لیے عمرانی و فطری علوم بھی نصاب میں شامل ہونگے اور پھر ان سب علوم کی تحصیل کے لیے زبان و ادب کو بھی نصاب میں نمایاں مقام حاصل ہو گا ۔ الغرض اسلامی نصاب کا دامن بڑا وسیع ہو گا ۔ لیکن صحتِ علم کے اعتبار سے بہرحال قرآن و سنت کو معیار کی حیثیت حاصل ہو گی ۔

حکمتِ تدریس

اسلامی حکمت تدریس میں اسلامی نصاب کی طرح بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔ ہر وہ طریقہ اسلامی نقطۂ نظر سے تدریسی حکمت عملی کا حصہ بن سکتا ہے جس سے ابلاغ مؤثر ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معلمانہ حکمت عملی میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ خطابی طریق یا طریق تقریر کا استعمال تو عام طور سے معلوم ہے۔ اس کے علاوہ طریق سوال و جواب اور مظاہراتی طریق کے اطلاق کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ تدریس کے نفسیاتی اصولوں کا اطلاق بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں عام ملتا ہے۔اسلامی نقطۂ نظر سے معلم اور متعلم دونوں ایک مقدس عمل میں شریک ہوتے ہیں لہٰذا دونوں ہی قابل احترام ہیں۔

یہاں یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ اسلام، تعلیم بذریعہ عمل کا بڑا علمبردار ہے۔ دراصل اسلام "علم برائے علم" نہیں بلکہ علم برائے عمل کا قائل ہے۔ چنانچہ بے عمل عالم کو ایسے گدھے کے مترادف قرار دیا جاتا ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ایسا علم قابلِ قدر ہے جو انسان میں ایمان اور عمل کی پختگی کا باعث بنے۔

تصورِ انتظام:

انتظامیات میں اسلام کا تصور حکمرانی کی بجائے خدمت کے جذبے پر مبنی ہوتا ہے۔ ناظمِ تعلیمات سے لیکر سربراہِ مملکت تک پورا انتظامی ڈھانچہ تعلیمی کارکنوں کے لیے سہولیات کی فراہمی پر مامور ہوتا ہے اور ان کے کام میں مداخلت سے گریز کرتا ہے۔ معلم کو خود۔ مختار حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ خود معلم اپنے اس اختیار میں آخرت کی جواب دہی کے احساس کے تابع ہوتا ہے۔ وہ اس جذبہ سے سرشار ہوتا ہے کہ علم کا جو ذخیرہ اسے مِلا ہے اسے آگے پہنچانا اُس کی دینی ذمہ داری ہے۔ فرض کا یہ احساس اسے طلبہ کے لیے شفیق بنا دیتا ہے اور حکامِ بالا کو نظم و نسق میں جابرانہ انداز سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ضبط طلبہ کے معاملے میں خارجی قواعد و ضوابط حتیٰ کہ ہلکی پھلکی بدنی سزا کی بھی گنجائش موجود ہے۔ لیکن اصل ضبطِ بہر حال ضبط نفس ہے، جس کی بنیاد خدا ترسی پر ہے۔ معلم اور متعلم دونوں شرح صدر کے ساتھ اس تصور میں یقین رکھتے ہیں کہ وہ خدا کے سامنے جواب دہ

ہیں اور خدا ہر حال میں انھیں دیکھ رہا ہے ۔

اوپر کی بحث سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات ترقی پسندیت اور روایت پسندیت سے مختلف اور ممتاز فلسفہ ہے ۔ اسلام کی اساس وحی الٰہی پر ہے جو علم کا قطعی ذریعہ ہے ۔ اس سرمایہ علم کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ قرار دیا ہے ۔ چنانچہ معاملہ نظامِ حیات کا ہو یا نظامِ تعلیم کا ، اسلام ہی واضح اور قطعی رہنمائی فراہم کر سکتا ہے ۔ پھر اس فلسفے کا یہ خاص امتیاز ہے کہ یہ کسی بھی نئے انکشاف اور نئی دریافت کو قبول کرنے کے لیے تیار رہتا ہے ۔ بلکہ اسلام میں تو تحقیق اور اجتہاد کو زندگی کا اہم جز قرار دیا گیا ہے ۔ اس طرح اس میں قدیم کی حفاظت اور جدید کی تلاش ، جستجو اور جانچ پرکھ کے لیے واضح احکامات ہیں ۔ یوں علم کے حتمی و ابدی سرمائے اور اجتہادی کاوشوں کے امتزاج سے اسلام کا تعلیمی نظام دنیا کے لیے بھلائی اور ترقی کے داعی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے ہے ۔ اب یہ دنیا والوں کا کام ہے کہ اس سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں ۔

مشقی سوالات

1 – انسان ، کائنات اور خدا تینوں کا وجود حقیقی ہے ۔ بحث کیجیے ۔

2 – آج سائنس کا دور ہے لہٰذا فلسفے کے مطالعے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے ، بحث کیجیے ۔

3 – تعیین مقاصد ، نصابِ تعلیم اور حکمتِ تدریس کے حوالے سے تعلیم پر فلسفے کے اثرات بیان کیجیے ۔

4 – فلسفہ تعلیم کو متاثر کرتا ہے تعلیم فلسفہ کو نہیں ۔ بحث کیجیے ۔

5 – اسلام ایک ترقی پسند فلسفہ ہے ۔ بحث کیجیے ۔

6 – اخلاقیات ، مقاصدِ تعلیم ، نصاب اور حکمتِ تدریس کے اعتبار سے ترقی پسندیت ، روایت پسندیت اور اسلام کا تقابل کیجیے ۔

7 – آج کا دور ترقی پسندیت کا دور ہے ۔ بحث کیجیے ۔

8 – روایت پسندیت کے اہم تصورات کا تنقیدی جائزہ لیجیے ۔

9 – اسلامی نقطۂ نظر سے ذرائع علم پر نوٹ لکھیے ۔

10 – ذیل کے بیانات میں خالی جگہوں کو پُر کیجیے ۔

- فلسفے کا موضوع مطالعہ ---------- ہے ۔
- فلسفے کا طریق مطالعہ ---------- ہے ۔
- نظام تعلیم کے چار عناصر ہیں ۔ تعیین مقاصد ، تشکیلِ نصاب ، ---------- اور انتظامیات ۔

11 – درج ذیل بیانات اگر صحیح ہیں تو ان کے سامنے "ص" اور اگر غلط ہیں تو ان کے سامنے "غ" کے گرد دائرہ لگائیے ۔

- ترقی پسندیت ایک الحادی فلسفہ ہے ۔ ص غ

- تعلیم کا فرض صرف یہ ہے کہ معاشرے کے فلسفے کو آگے منتقل کر دے ۔ ص غ
- ترقی پسندیت میں مادی کائنات سے آگے کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا ۔ ص غ
- ترقی پسندیت کے نزدیک وحی علم کی سب سے ترقی یافتہ شکل ہے ۔ ص غ
- روایت پسندیت کے نزدیک ثبات تغیر سے زیادہ حقیقی ہے ۔ ص غ

چوتھا باب

تعلیم کی معاشرتی اور معاشی بنیادیں

معاشرہ اور تعلیم :

جب چند افراد شعوری طور سے مشترکہ مقاصد کے ساتھ مل جل کر رہنے لگیں تو معاشرہ وجود میں آ جاتا ہے گویا معاشرہ بجائے خود کوئی الگ وجود نہیں بلکہ یہ افراد ہی سے تشکیل پاتا ہے ۔ افراد ہی کے رہن سہن ، رسوم و رواج ، مشترکہ اندازِ فکر ، مذہبی ، معاشرتی اور ثقافتی اقدار میں مماثلت معاشرے کی تخلیق کا باعث بنتی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ انسان معاشرت پسند ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کو مل جل کر رہنے کی خواہش ودیعت کر رکھی ہے ۔ انسانی نسل کے تسلسل اور تحفظ کے لیے بھی معاشرے کا وجود ضروری ہے ۔

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ہر چیز اس کے لیے اجنبی ہوتی ہے ۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے ماحول سے مانوس ہوتا جاتا ہے ۔ اس نئے ماحول کے ساتھ اپنائیت کی علامت یہ ہے کہ وہ اس قسم کی حرکات و اعمال کرنے لگتا ہے ، جو وہ اپنے اردگرد کے ماحول میں مشاہدہ کرتا ہے ۔ بچّے کی زبان ، اخلاق و عادات ، کھیل کود وغیرہ اس کی واضح مثالیں ہیں ۔ اس طرح معاشرے کا رکن بننے کے ساتھ ساتھ وہ مسلسل تعلیمی عمل سے بھی گزرتا رہتا ہے ۔ اس عمل پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں معاشرتی پہلو تعلیمی پہلو کے لیے بنیاد کا کام دیتا ہے ۔

بچّے کے ابتدائی معلم اس کے والدین ہوتے ہیں ۔ جو بچّے کی شخصیت پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑتے ہیں ۔ گھریلو ماحول بچّے کی تعلیم و تربیت میں بہت اہم کردار ادا کرتا

ہے کیونکہ بچہ فطری طور پر وہ سب کچھ اپنانے کی کوشش کرتا ہے جو وہ دیگر افرادِ خانہ کو کرتے دیکھتا ہے ۔ اس کے علاوہ بڑے بھی بچے کو بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کی باقاعدہ تعلیم دیتے ہیں ۔ مثلاً بڑوں کی عزت کرنا، اللہ تعالی کو ماننا، بُری باتوں سے بچنا اور اچھی باتوں کی ترغیب دینا یہ ایسی باتیں ہیں جن کی بنیاد عموماً گھر ہی میں رکھ دی جاتی ہے اور ان کے نتائج بہت دور رس ہوتے ہیں ۔

زمانہ قدیم کا معاشرہ اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا جتنا کہ آج ہے ۔ قدیم معاشرے کی ضروریات اور رسوم و رواج بھی زیادہ نہ تھے ۔ والدین کے لیے اپنے بچوں کو جملہ معاشرتی اقدار کی تعلیم دینا مشکل نہ تھا ۔ رفتہ رفتہ معاشرہ ترقی کی منازل طے کرتا گیا اور ساتھ ہی انسانی معاشرے کی ضروریات و اقدار میں بھی تبدیلی آتی گئی ۔ اس طرح ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں ۔ اس صورتِ حال میں معاشرے کے لیے بچوں کو گھروں پر مکمل تعلیم دینا ممکن نہ رہا ۔ چنانچہ معاشرے نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایسے ادارے قائم کیے جو معاشرے کی اس ضرورت کی تکمیل کر سکیں ۔ اس طرح رسمی تعلیمی ادارے وجود میں آئے تاکہ افراد ان اداروں میں تعلیم حاصل کر کے نہ صرف معاشرے میں اپنے لیے کوئی مقام بنا سکیں بلکہ معاشرے کی تعمیر میں بھی اپنا کردار ادا کر سکیں ۔

تعلیمی عمل صرف معاشرے ہی میں ممکن ہے ۔ نظامِ تعلیم کا دارومدار معاشرے کی اقتصادی، سیاسی، مذہبی، اجتماعی اور ثقافتی اقدار و ضروریات پر ہے ۔ انہی سے مقاصدِ تعلیم، نظامِ تعلیم اور طریقِ تدریس کا تعین ہوتا ہے ۔ تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو فرد کا سماجی منصب متعین کرتا ہے ۔ فرد کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کے مقاصد جو معاشرہ مقرر کرتا ہے، ان کے حصول کے لیے دیانتداری سے عمل کرے ۔

کسی بھی ملک کے مستقبل کا انحصار اس ملک کے معاشرے اور تعلیم کے باہمی تعامل پر ہوتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ایک دوسرے کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھا جائے ۔ ماہرینِ تعلیم اسوقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ بدلتی ہوئی دنیا کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے طریقوں کو ان کے مطابق ڈھالنے اور سوچنے کے

قابل نہیں ہو جاتے ۔ معاشرہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے ۔ ایک منزل کو پا لینے کے بعد نئی منازل کا تعین کیا جاتا ہے اور پھر اس کے حصول کے لیے تگ و دو شروع ہو جاتی ہے ، اس طرح یہ عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے ۔

اچھی تعلیم معاشرے کی اہم ضرورت کو فراموش نہیں کر سکتی ۔ دونوں میں باہمی ربط و اتصال یعنی ہم آہنگی ہی سے مطلوبہ نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں ۔ اس کے بغیر معاشرہ فعال اور متحرک نہیں بن سکتا ۔ معاشرتی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھا جائے اور آئندہ کی منصوبہ بندی کے لیے موجودہ حالات کو بہتر سے بہتر طور پر استعمال کیا جائے ۔

معاشرے میں مدرسے کا کردار :

مدرسہ ایک چھوٹے سے معاشرتی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے جو طلبا کے لیے ایسے تجربات فراہم کرتا ہے جن سے گزر کر افراد کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں اور ان میں اجتماعی شعور پیدا ہوتا ہے ۔

مدرسہ میں بچّے مختلف گھرانوں سے آتے ہیں ۔ ان کا گھریلو ماحول اور صلاحیتیں یہاں تک کہ خیالات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں ۔ جب کہ مدرسہ میں ایک خاص قسم کا ضبط ہوتا ہے جس کا اثر ہر آنے والے بچّے کی شخصیت پر پڑتا ہے ۔ بچّہ خود کو اس نئے ماحول میں ڈھالنے کی خواہش بھی رکھتا ہے اور مجبور بھی ہوتا ہے ۔ سکول میں بچّہ دوسرے بچّوں سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا ۔ کیونکہ مل جل کر رہنا انسانی فطرت کا خاصا ہے اور انسان معاشرے کے جس گروہ میں رہتا ہے اسی سانچے میں ڈھل جاتا ہے اسی لیے ہر نیا آنے والا بچّہ پہلے سے موجود بچّوں کے اطوار اپنانے کی کوشش کرتا ہے اور اکثر اوقات یہ تبدیلی غیر شعوری ہوتی ہے ۔ مدرسے کا معاشرہ تمام بیرونی معاشروں سے زیادہ منظم اور منضبط ہوتا ہے ۔ اسی لیے اس کے اثرات بچّے کی شخصیت پر گھر ، گلی ، محلے اور علاقائی معاشروں سے زیادہ گہرے ہوتے ہیں ۔ اس کے علاوہ مدرسے کو پورے معاشرے کی تائید اور حمایت بھی

حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ بچوں کی شخصیت اور کردار کی تربیت کے لیے اہم اثرات رکھتا ہے۔

تعلیمی ادارے چونکہ معاشرہ ہی قائم کرتا ہے اس لیے وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ مدرسہ نہ صرف افراد کی ذات یعنی شخصیت کی ہمہ پہلو تربیت کرے بلکہ ایسے افراد پیدا کرے جو معاشرے کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار بہ طریقِ احسن ادا کر سکیں۔ یعنی تعلیم کو فرد اور معاشرہ دونوں کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

مدرسہ مندرجہ ذیل مختلف ذرائع سے تعلیمی عمل میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے:

1 — مدرسہ کا نظم و ضبط:

نظم و ضبط کا سب سے پہلا اصول وقت کی پابندی ہے۔ سکول کا خاص وقت پر لگنا اور بند ہونا، مختلف مضامین کے لیے اوقاتِ کار کی تقسیم، اساتذہ کا وقت پر کمرۂ جماعت میں آنا، ان سب باتوں سے طلبہ میں وقت کی پابندی کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے اور تربیت بھی ملتی ہے۔ اگرچہ طلبہ مختلف معاشرتی ماحول سے آتے ہیں لیکن ہر طالب علم کا ایک ہی لباس یعنی سکول یونیفارم بچوں میں یگانگت کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ کمرۂ جماعت میں خاموش رہنے اور ایک دوسرے سے مل جل کر کام کرنے سے طلبہ میں اچھی عادات پیدا ہوتی ہیں جو کہ یقیناً معاشرے کے لیے بھی خوش آئند ہیں۔ مدرسے میں بچوں کو ان عادات و اطوار کی تربیت دی جاتی ہے جنھیں معاشرہ میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جبکہ معاشرے کی منفی اقدار کو مدرسے میں مسترد کر دیا جاتا ہے۔

2 — نصابی اور اضافی کتب:

تعلیم جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ایک معاشرتی عمل ہے جس کے ذریعے معاشرہ اپنے گراں قدر ثقافتی سرمائے کی حفاظت کرتا ہے۔ معاشرہ نسل در نسل یہ سرمایہ اپنی اولاد کو منتقل کرتا رہتا ہے اور ساتھ ہی اپنی معاشرتی زندگی کی تجدید بھی کرتا رہتا ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں یہ تسلسل کتابی شکل اور دیگر رسمی و غیر رسمی سرگرمیوں کے ذریعے قائم ہے۔ کتابوں کے ذریعے بچوں کو صرف انھی چیزوں کی تعلیم دی جاتی ہے جن کو معاشرے میں اچھا سمجھا جاتا ہے، یا وہ معاشرے کی ضروریات کی تکمیل کے لیے اہم ہوتی ہیں۔ نصابی کتب کے علاوہ بچے مدرسے میں رسائل و اضافی کتب اور اخبارات کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔

یہ مطالعہ طلبہ کی ذہنی بالیدگی اور ارتقا کے لیے بہت ہی سود مند ہے ۔ تاریخ و ادب کی کتب کا مطالعہ بچّوں کو اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں کے ساتھ ان کی ثقافت کے بارے میں بھی معلومات بہم پہنچاتا ہے ۔

3 – نصابی سرگرمیاں :

مدرسے کا کام بچّوں کو صرف کتابی علم بہم پہنچانا ہی نہیں بلکہ بچّوں کے لیے مختلف تجربات کے مواقع مہیا کرنا بھی ہے جن سے گزر کر بچّے کی مختلف صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع ملے ۔ کھیلیں نہ صرف بچّوں کی صحت کے لیے سود مند ہیں بلکہ بچّوں کی شخصیت پر ان کا اثر بھی بہت گہرا پڑتا ہے ۔ بچّوں میں مسابقت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ۔ بچّہ ہار اور جیت کے تجربات سے دو چار ہوتا ہے ۔ بچّے میں حقائق کا سامنا کرنے کے لیے قوتِ برداشت پیدا ہوتی ہے ۔ اسی طرح بزمِ ادب کا انعقاد اور مباحثے بھی بچّوں کی ذہنی نشوونما میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں اور یہ سب تجربات بچّوں کی آئندہ عملی زندگی میں بہت سود مند ثابت ہوتے ہیں ۔

4 – معلم کا ذاتی کردار :

معلم کی شخصیت بچّے کے لیے بہت ہی اہمیت کی حامل ہوتی ہے ۔ بچّے اپنے استاد کی تمام حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان کے لیے اپنے ذہن میں ایک خاص رائے قائم کر لیتے ہیں ۔ اساتذہ کے ذاتی کردار کا اثر بچّوں کی شخصیت پر بہت گہرا پڑتا ہے ۔ طلبہ ایک اچھے استاد کو کبھی فراموش نہیں کرتے بلکہ ان کو اپنے لیے نمونہ بنا کر ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

5 – معلمین کے باہمی روابط :

مدرسے کے معاشرے میں طلبہ کے بعد دوسری اہم مخلوق اساتذہ ہیں جن کے ہاتھوں میں آئندہ قوم کی باگ ڈور ہوتی ہے ۔ یعنی وہ معمارِ قوم ہیں ۔ اگر مدرسے کے تمام اساتذہ قومی جذبے سے سرشار ہوں اور اپنے فرائض کو پہچانتے ہوئے مل جل کر بچّوں کو مستقبل کے لیے تیار کریں تو یقیناً نتائج خوشگوار ہونگے اور اگر یہی اساتذہ اپنی ذاتی اغراض کو پیش نظر رکھ کر ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کرتے رہیں تو اس چپقلش کا طلبہ کی شخصیت پر یقیناً

بُرا اثر پڑے گا ۔ مندرجہ بالا حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مدرسے اور معاشرے کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے ۔ معاشرہ اپنی معاشرتی اقدار کی حفاظت ، نسلی تسلسل اور تعمیر و ترقی کے لیے مدرسے قائم کرتا ہے اور جواباً مدرسہ بچوں کو معاشرتی زندگی سے ہم آہنگ کرنے اور معاشرے کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل بناتا ہے ۔ اس طرح سے معاشرہ اور مدرسہ دونوں کا ایک دوسرے پر انحصار ہے ۔ یعنی دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں ۔

تعلیم اور معاشیات

تعلیم کی معاشی اساس :

کسی بھی معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کا دار و مدار اس معاشرے کے معاشی وسائل اور ان کے صحیح استعمال پر ہے ۔ اگر کسی معاشرے کے پاس قدرتی وسائل تو ہوں لیکن وہ ان کے استعمال سے واقف نہ ہو تو وسائل کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہوگا ۔ اسی طرح وسائل کی کمی بھی معاشرے کی معاشی ترقی پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ لیکن اس کمی کو محنت اور منصوبہ بندی سے کافی حد تک پورا کیا جا سکتا ہے جبکہ بعض حالات میں قدرتی وسائل کی افراط کے باوجود ترقی ممکن نہیں ہوتی ۔ مثال کے طور پر اگر جاپان اور جرمنی کو لیا جائے تو دوسری عالمی جنگ میں شکست کے بعد خیال تھا کہ یہ دونوں ممالک اب کبھی بھی اقتصادی طور پر سر اٹھانے کے قابل نہیں ہونگے لیکن یہ دونوں ممالک اپنے محدود قدرتی وسائل کے باوجود صنعتی ترقی کی انتہائی بلندیوں پر ہیں ۔ اسی طرح ڈنمارک بھی ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہے جبکہ ان کے وسائل بھی بہت محدود ہیں ۔ دوسری طرف وینیزویلا اور عرب ممالک کو لیجیے جن کے پاس بے انتہا قدرتی وسائل ہیں لیکن اس کے باوجود ترقی پذیر ممالک میں شمار ہوتے ہیں ۔ اسی طرح کے حالات افریقی ممالک نائجیریا اور جنوبی افریقہ کے ہیں جن کے پاس وسائل تو ہیں لیکن پھر بھی ترقی کی رفتار اتنی سست ہے کہ ان کا شمار ترقی پذیر ممالک میں ہوتا ہے ۔

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں انسان سائنس اور ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر زمین سے اٹھ کر آسمان کی وسعتوں میں تحقیق کے جال پھیلا رہا ہے ۔ یہ تعلیم ہی ہے جس نے انسانی فطرت کو ایک نیا اسلوب دیا ہے ۔ اگر علم و فن کی منصوبہ بندی صحیح خطوط پر کی جائے تو یقیناً معاشرہ انفرادی ، اجتماعی اور اقتصادی طور پر ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے گا ۔

افرادی قوت اور تعلیم :

آج کے اس صنعتی دور میں مدرسے کی ذمہ داری ہے کہ بچّوں کی تربیت ان کے رجحانات کے مطابق اس طرح کرے کہ وہ زندگی میں معاشرے کے مختلف شعبوں میں مختلف ذمہ داریاں سنبھالنے کے اہل ہو سکیں ۔ دورِ جدید میں معاشرہ چاہے صنعتی ہو یا زرعی ، دونوں شعبوں میں خصوصی تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ سائنسی تجربات نے صرف صنعتی ترقی ہی کے لیے کام نہیں کیا بلکہ زراعت میں بھی سائنس کی تعلیم نے کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں ۔ آج کی زمین مشینی کاشت ، بہتر بیج اور ادویات کی بدولت اس مقدار سے کئی گنا زیادہ پیداوار دے رہی ہے جو آج سے چند سال پہلے تھی ۔ یہ سب تعلیم ہی کی بدولت ہے ۔ اگر تعلیمی ادارے ملکی افراد ہی کو پیشوں کے لیے زیورِ تعلیم سے آراستہ کر کے معاشرے کی ضروریات کو پورا کریں تو ملک لازمی طور پر معاشی ترقی کی راہ پر گامزن ہو گا ۔ جس کے مثبت اثرات نہ صرف معاشرے کی سماجی ، سیاسی اور گھریلو زندگی پر پڑیں گے بلکہ معاشی خوشحالی کی بنا پر انسانی سوچ بھی متاثر ہو گی ۔

یونیسکو کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ جو بچّہ سماجی لحاظ سے بلند ہے اس کے پاس زیادہ عمدہ غذا ، زیادہ اچھا مکان اور دیگر ضروریات زندگی کا سامان وافر مقدار میں ہوتا ہے اور یہی سہولتیں اسے مستقبل میں دوسروں سے ممتاز بنا دیتی ہیں ۔ اسے ہر وہ چیز مثلاً کتاب ، کھلونے اور نشوونما کے لیے درکار تمام اشیا اوائل عمر ہی میں مل جاتی ہیں ۔ اس کے علاوہ سب سے اہم چیز بچّے کے گھر کا ماحول ہے جس کے ذریعے کافی علم غیر شعوری طور پر بچّے کو منتقل ہوتا رہتا ہے ۔ ان حالات میں متمول والدین کے بچّے کا غریب والدین کے بچّے سے

بہتر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ۔

تعلیم اور معیشت کے باہمی تعلق کی ایک شہادت یہ ہے کہ اگر معاشرے کی غربت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ مسئلہ معاشی سے زیادہ تعلیمی ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس کا حل بھی تعلیمی عمل ہی میں مضمر ہو گا ۔ اگر تعلیم افراد میں وہ تمام خوبیاں اور اوصاف پیدا کر دے جو ایک جدید معاشرے کے لیے ضروری ہیں مثلاً تحقیق ، تجربہ ، ہنر مندی ، مستعدی، احساس ذمہ داری اور کام کرنے کی لگن تو معاشرہ اپنی تکمیل کے راستے خود نکال لیتا ہے ۔ کوئی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک اس میں تعلیم و تربیت کا ایسا نظام قائم نہیں ہو جاتا جو معاشرے کے ہر شعبۂ زندگی کے لیے موزوں افرادی قوت مہیا کرنے کا اہل ہو ۔ گویا تعلیمی نظام اس قسم کا ہونا چاہیے جس میں درج ذیل خصوصیات موجود ہوں ۔

1 ۔ معاشرتی ، سیاسی اور اقتصادی ترقی میں مدد گار ثابت ہو ۔
2 ۔ ایسے مواقع فراہم کرے کہ طلبہ اپنی قابلیت کا مظاہرہ کر سکیں ۔
3 ۔ طلبہ کی صحیح سمت میں راہنمائی کرے جس سے وہ مختلف پیشوں کا انتخاب کر سکیں ۔
4 ۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے حصول کے ذرائع فراہم کرے ۔
5 ۔ صنعتی ، تجارتی اور زرعی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کرے ۔
6 ۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے لیے اہل افرادی قوت تیار کرے ۔
7 ۔ ابتدائی تعلیم پر خصوصی توجہ دے تا کہ طلبہ کی تعلیمی بنیادیں مضبوط اور پائیدار ہوں ۔
8 ۔ ترقی کے ساتھ ساتھ معاشرے اور تعلیم کے مقاصد میں تبدیلی آتی رہتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ نصابِ تعلیم میں ہر وقت ترمیم کی گنجائش ہو ۔
9 ۔ تعلیمی اداروں میں جدید علوم پر تحقیق کے مواقع فراہم کرے ۔ مجموعی طور پر تعلیمی حکمت عملی ایسے خطوط پر ترتیب دی جانی چاہیے جو سماجی اور معاشرتی ترقی کی رفتار کو تیز تر کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو ۔

تعلیمی سرمایہ کاری

تعلیمی سرمایہ کاری کا بنیادی مفہوم تو وہی ہے جو کاروباری ، صنعتی یا زرعی سرمایہ کاری کا ہے یعنی آپ نے کسی کاروبار صنعت یا زراعت پر روپیہ صرف کیا تو کچھ عرصہ بعد آپ کے لگائے گئے سرمائے کی واپسی شروع ہو جائے گی اور نہ صرف آپ کی کل رقم واپس مل جائے گی بلکہ منافع بھی ملے گا ۔ اس طرح آمدنی بڑھتی ہی چلی جائے گی ۔

یہی صورت حال تعلیمی سرمایہ کاری میں وقوع پذیر ہوتی ہے جو والدین ، معاشرے اور قومیں اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے روپیہ، محنت اور وقت صرف کرتے ہیں وہ صنعتی سرمایہ کاری سے بھی زیادہ نفع حاصل کرتے ہیں ۔ اور اس سے بھی زیادہ اہم فوائد وہ ہیں جو تعلیم سے متصف انسان کی شخصیت کے علمی ، اخلاقی اور تہذیبی پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں ۔ صنعتی اور کاروباری سرمایہ کاری کے نتائج زیادہ مستقل اور دیرپا ہوتے ہیں ۔

تعلیمی سرمایہ کاری کا پھل جلد حاصل نہیں ہوتا۔ یہ ایک طویل اور صبر آزما سلسلہ ہے۔ بچہ سکول میں داخل ہونے کے بعد عموماً سولہ سترہ برس تعلیم حاصل کر کے اس قابل ہوتا ہے کہ ایک ڈاکٹر ، انجینئر یا فنی ماہر کے طور پر ذمہ داری سنبھال سکے لیکن عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد وہ نہ صرف اپنی ذات کے لیے سود مند ہو گا بلکہ اس کی تعلیم و تربیت کا اثر اس کی پیشہ ورانہ کارکردگی پر بھی پڑے گا اور اس طرح سے بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کا فائدہ معاشرے کو بھی ہو گا ۔

تاریخ شاہد ہے کہ صنعتی انقلاب کے بعد تعلیمی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا ۔ 1850 ء سے پہلے اور بعد کے دور میں آپ کو واضح فرق محسوس ہو گا ۔ صنعتی انقلاب کے دوران میں سائنسی اور تکنیکی ایجادات اور ان سے حاصل ہونے والے فوائد اس سرمایہ کاری کا نتیجہ تھے جو قوم نے تعلیمی اصلاحات اور ان کی ترویج کے لیے کی تھی ۔

اقتصادی ترقی کا دارومدار تربیت یافتہ افرادی قوت پر ہے جاپان نے دوسری عالمی جنگ میں شکست سے دوچار ہونے کے بعد ہی سے اس مفروضہ پر مسلسل کام کیا اور آج اس

کے نتائج تمام دنیا کے سامنے ہیں ۔ جاپان اقتصادی دوڑ میں نہ صرف ترقی یافتہ ممالک کے شانہ بشانہ چل رہا ہے بلکہ بہت سی چیزوں میں تمام ممالک پر سبقت لے گیا ہے ۔
جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں کل صنعتی پیدوار کا صرف ایک چوتھائی حصہ مادی وسائل کا مرہون منت ہوتا ہے جب کہ باقی تین چوتھائی اضافہ صنعتی ایجادات اور سائنسی علوم کی بنا پر ہوا ہے ۔ تعلیمی سرمایہ کاری کی بنا پر فی کس آمدنی میں اضافے کا واضح ثبوت ہنسن کی تعلیمی اقتصادیات کے موضوع پر تحقیقات سے بھی ملتا ہے ۔ اس کے نتائج سے معلوم ہوا کہ 1960ء میں امریکہ میں ثانوی تعلیم رکھنے والے بڑھئی کی آمدنی پرائمری پاس بڑھئی سے 900 ڈالر زیادہ تھی ۔ بجلی کا کام کرنے والوں میں یہ فرق 800 ڈالر اور آلات سازوں میں یہ فرق 600 ڈالر سالانہ تھا ۔

لارنس ہیڈلے نے 1976ء میں تعلیم کے نفع بخش ہونے کا اندازہ لگانے کے لیے تحقیق کی ، جس کے نتائج کچھ اس طرح ہیں کہ 20 برس کی عمر تک کے میٹرک پاس مزدور پیشہ لوگوں کی سالانہ آمدنی اسی عمر کے ان پڑھ لوگوں سے چار گنا اور پرائمری پاس مزدوروں سے اڑھائی گنا زیادہ تھی ۔ جب کہ 21 سے 30 برس کے گریجویٹ مزدور پیشہ ، ان پڑھ مزدوروں سے تقریباً گیارہ گنا اور پرائمری پاس سے تقریباً ساڑھے چھ گنا زیادہ کماتے تھے ۔

فوائدِ تعلیم

ہم تعلیم سے کیا حاصل کرتے ہیں، اس کا تعلق درحقیقت مقاصد تعلیم سے ہے ۔ تعلیم ہمیں وہی کچھ دیتی ہے جسے پیش نظر رکھ کر ہم تعلیمی منصوبہ بندی کرتے ہیں ۔ اگر ہمیں اپنی صنعتوں کے لیے فنی ماہرین کی ضرورت ہے تو ہم صنعتی تعلیم کو زیادہ اہمیت دیں گے اور اسی طرح زرعی ، تجارتی اور اخلاقی اغراض و مقاصد کے لیے انھی پہلوؤں سے متعلق تعلیم کا بندوبست کیا جائے گا۔ تعلیم کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کا اثر متعلم کی پوری شخصیت پر ہوتا ہے ۔ تعلیم کا دوسرا بڑا فائدہ حاصل کردہ تعلیم کو عملی زندگی میں استعمال کرنا ہے ۔ تعلیم کے فوائد کو بنیادی طور پر درج ذیل دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

1 ۔ تعلیم کے مادی فوائد 2 ۔ تہذیبی و اخلاقی فوائد

1 ۔ مادی فوائد:

پوری تاریخ انسانی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جائے گی کہ انسانی تہذیب و تمدن بتدریج ارتقائی منازل طے کر کے آج اس ترقی یافتہ دور میں داخل ہوا ہے اور اس تمام ترقی کے پیچھے تعلیم ہی کی کارگزاری نظر آئے گی ۔ زمانہ قدیم میں انسان اپنے بدن کو درختوں کے پتوں سے ڈھانپتا تھا ، غاروں میں اور درختوں پر بسیرا کرتا تھا ۔ لیکن آج اس قسم کی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ نت نئی سائنسی اور تکنیکی ایجادات نے انسانی زندگی کو کیا کچھ دیا ہے اس کا اندازہ ہم سب لگا سکتے ہیں ۔

دور نہ جائیے اس صدی کے اوائل ہی کا جائزہ لے لیجیے کہ برصغیر میں عوام کے پاس کیا کیا سہولیات اور آسائشیں تھیں ، ذرائع آمدورفت کیا کیا تھے ؟ ذرائع مواصلات اور ذرائع ابلاغ کی کیا حالت تھی ؟ قدیم ذرائع و وسائل کا موجودہ دور کی سہولتوں اور آسائشوں سے موازنہ کیا جائے تو مادی ترقی کی رفتار کا اندازہ لگانے میں زیادہ دقت نہیں ہوگی ۔ یہ سب ترقیاں اور ایجادات تعلیم ہی کی مرہونِ منت ہیں ۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تعلیم عام ہونے سے ترویج علم و فن کی راہ آسان ہو جاتی ہے اور اگر ان کی ترویج صحیح خطوط پر کی جائے تو قوم کے انفرادی ، اجتماعی اور اقتصادی نظام کا ٹھوس بنیادوں پر قائم ہو جانا ایک یقینی امر ہے ۔ تعلیم کا فروغ صنعت و حرفت و تجارت و زراعت کا فروغ ہے اور ان سب کا فروغ قومی خوشحالی کا مظہر ہے ۔

جو کچھ تعلیمی اداروں میں پڑھایا جاتا ہے اس کا اثر صرف متعلم ہی پر نہیں پڑتا بلکہ اس کے بالواسطہ اثرات معاشرے پر بھی پڑتے ہیں اور پھر اس کے دور رس اثرات افراد کی گھریلو اجتماعی اور کاروباری زندگی تک پہنچ جاتے ہیں ۔ یعنی طلبہ کے تعامل سے معاشرے کی ہیئت ترکیبی بنتی یا بگڑتی رہتی ہے ۔

سائنسی تعلیم کی بدولت اس وقت دنیا کو جو صنعتی اور اقتصادی ترقی حاصل ہوئی ہے اس کا اثر اب غیر محدود ہے ۔ ایجاد دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہو جلد یا بدیر تمام دنیا کے

عوام اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اقوام بھی جو ابھی ترقی کی ابتدائی منازل طے کر رہی ہیں دیگر ممالک سے درآمد شدہ سائنسی ایجادات سے مستفید ہو رہی ہیں ۔

ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم کی بدولت جو انقلاب آیا ہے اس نے لوگوں کے طرز فکر ، انداز بود و باش ، حفظان صحت ، آدابِ مجلس ، کھانے پینے کے طریقے ، مکانوں کی ساخت غرض زندگی کی ایک ایک چیز کو بدل ڈالا ہے ۔ یہ تبدیلی نئی ایجادات اور تعلیم عام ہونے کی وجہ سے بڑی سرعت کے ساتھ معاشرتی زندگی پر اثرانداز ہو رہی ہے ۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں معاشرے کے لیے ایسے افراد کی ضرورت ہے جو زراعت ، تجارت ، حکومت ، صنعت و حرفت اور دیگر فنون میں کمال درجہ کی مہارت رکھتے ہوں تاکہ معاشرے کی ترقی کی تیز رفتاری قائم رہے اور یہ سب فنکار تعلیم ہی مہیا کرتی ہے ۔

تکمیل تعلیم کے بعد فرد عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے اور اپنے حاصل کردہ علم کو اپنی روزی کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے جو زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ باقاعدہ حصول تعلیم کے بغیر بھی انسان اپنی روزی کما سکتا ہے ۔ بلکہ ہزاروں نہیں لاکھوں غیر تعلیم یافتہ لوگ اپنی روزی کما رہے ہیں لیکن نہ صرف دونوں کے رہن سہن ، ان کی گفتگو اور ان کے معاشرتی تعلقات میں نمایاں فرق ہے ۔ بلکہ دونوں کی آمدنی بھی مختلف ہو گی جیسا کہ تحقیقات سے ثابت ہے۔ اس کا ذکر ہم تعلیمی سرمایہ کاری کے تحت کر چکے ہیں ۔ ان تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم اور بالخصوص تعلیم کا وہ حصہ جس کا زیادہ تعلق سائنسی تکنیکی ، زرعی ، صنعتی و حرفتی اور دیگر پیشہ ورانہ تربیت سے ہے، افراد کی آمدنی اور مجموعی قومی آمدنی اور شرح آمدنی میں قابل قدر اضافہ کا موجب بنتا ہے ۔

2 - تہذیبی فوائد :

تعلیم کو معاشی سرمایہ کاری قرار دینے کے حالیہ رجحان کی وجہ سے تعلیمی فوائد کا ایک اہم پہلو نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور وہ ہے تہذیبی پہلو ۔ معاشرے کی نشوونما اور صحیح خطوط پر رہنمائی ہی تعلیم کا اصل وظیفہ ہے ۔ اس حوالے سے تعلیم جو خدمت انجام دیتی ہے

اس کا ذکر عموماً سرمایہ کاری کی بجائے "صرف" (Consumption) کے زیرِ عنوان کیا جاتا ہے ۔ محققین نے صراحت کی ہے کہ اس پہلو سے بھی تعلیم پر خرچ کیے جانے والا سرمایہ بالآخر نفع بخش ثابت ہوتا ہے لہذا اس پہلو کو تعلیم کے سرمایہ کارانہ فوائد سے خارج نہیں کیا جا سکتا ۔ اس پہلو سے تعلیمی فوائد کو درج ذیل عنوانات کے تحت زیرِ بحث لایا جا سکتا ہے ۔

الف) علمی فوائد:

تعلیم جہاں ہنر و حرفت کی تربیت ، فروغ اور اشاعت کا انتظام کرتی ہے وہاں علوم و فنون کی ترقی اور اشاعت کا ذریعہ بھی بنتی ہے ۔ اس وقت دنیا جو سائنسی اور عمرانی علوم ، صنعتی فنون ، ٹیکنالوجی اور شعر و ادب اور فنون لطیفہ کے بیش قیمت سرمائے سے مالا مال ہے تو یہ سب تعلیم ہی کا فیض ہے۔ اس سرمائے میں جو روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے وہ بھی تعلیم کا مرہون منت ہے ۔ ذرا تصور کریں کہ اگر آج کسی وجہ سے تعلیمی عمل رک جائے تو اس وقت بیش بہا سرمایۂ علم موجود ہونے کے باوجود دنیا جہالت سے گھر جائے گی ۔ یہ سب سرمایہ ایک ایسے قیمتی دفینے کی حیثیت حاصل کر لے گا جس کا مصرف کسی کو معلوم نہیں ہو گا۔ قیامت کے قریب تعلیمی عمل رک جانے سے دنیا جس طرح جہالت میں مبتلا ہو جائے گی اس کی طرف ایک حدیث میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ دنیا سے علم کو اس طرح اٹھالے گا حتی کہ دنیا میں جہلا رہ جائیں گے ۔ جو بغیر علم کے فتوے دیں گے۔ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے ۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تعلیم کی اشاعت میں مالی سرمایہ کاری کی مادی منفعت کے مقابلے میں تہذیبی اور علمی منفعت کہیں افضل ہے ۔

ب) اخلاقی فوائد:

اخلاق کے لیے علم واضح اساس فراہم کرتا ہے ۔ جہالت گمراہی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے ۔ اوپر بیان کردہ حدیث میں اس طرف واضح اشارہ موجود ہے کہ بے علمی کے نتیجے میں بالآخر گمراہی پھیل جائے گی ۔ اخلاق ایک قیمتی زیور ہے اور یہ زیور تعلیم ہی کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے ۔ تاریخ میں ایسی بے شمار زریں مثالیں موجود ہیں اور آج معاشی ترجیحات

ے کے اس دور میں بھی ایسی مثالیں نایاب نہیں کہ زر و جواہر کے بجائے اعلیٰ اخلاق ہی آدمی کے لیے عزت اور شہرت کا باعث بنتا ہے ۔ تعلیم دراصل ہے ہی حسن کمال اور اعلیٰ اخلاق کی تربیت کا عمل ۔ چنانچہ قرآن حکیم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کا ذکر کرتے ہوئے تعلیم و تعلم اور تزکیۂ نفس کو ساتھ ساتھ بیان کیا ہے ۔ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے واضح الفاظ میں اپنے منصب معلمی کا فخریہ ذکر کیا اور یہ بھی واضح طور سے فرما دیا کہ میری بعثت کا مقصد یہ ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کر دوں ۔

تعلیم کے ذریعے اخلاقی تربیت کے نتیجے میں انسان صحیح معنوں میں انسان بنتا ہے ۔ اگر آج تعلیمی عمل رک جائے یا تعلیمی عمل کے مقاصد و وظائف میں سے تربیت اخلاق کو حذف کر دیا جائے تو یہ معاشرہ بظاہر انسانوں ہی کا معاشرہ ہو گا لیکن دراصل یہ معاشی حیوانوں کا ایک دہشتناک ہجوم ہو گا جس میں ہر فرد اپنی شکم پروری کے نام پر دوسرے کے مال و جان پر دست اندازی کے درپے ہو گا اور پھر جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق طاقتور لوگ پوری دولت پر قابو حاصل کر لیں گے ۔ بھوکے کتوں کا کوئی غول جب روٹی کے ٹکڑوں پر جھپٹتا ہے تو جو کیفیت ہوتی ہے وہ انسانی معاشرے کے لیے قابل قبول نہیں ۔ یہ تعلیم کا بہت بڑا کمال ہے کہ وہ معاشرے میں ایسی کیفیت پیدا نہیں ہونے دیتی ۔ تعلیم حقوق و فرائض کا شعور دیتی ہے اور اپنے حقوق کے تحفظ کا داعیہ عطا کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے اخلاص اور ایثار کے جذبے سے بھی سرشار کرتی ہے ۔ ایسا معاشرہ جہاں صحیح تعلیم کے ذریعے اخلاص ، ایثار اور خیر سگالی کے جذبات کا دور دورہ ہو ، معاشی عمل بھی زیادہ بارآور ہوتا ہے ۔ پھر نتیجہ وہی ہوتا ہے جو اسلام کے دور اوّل میں ہوا کہ زکوٰۃ دینے والے تو موجود ہوتے ہیں ، زکوٰۃ لینے والے تلاش کرنے پڑتے ہیں ۔ اور پھر معاشی استغنا اور اخلاقی عظمت کی وجہ سے امن و امان کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ ایک عورت تن تنہا زیورات سے لدی پھندی ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کرے تو اسے قطعاً کوئی خطرہ نہیں ہوتا ۔

ج) سیاسی فوائد :

سیاست معاشرے کو منضبط کرنے کا عمل ہے ۔ جہاں افراد کی اخلاقی اصلاح ضروری

ہے وہاں معاشرے میں اجتماعی نظم وضبط کا عمل بھی لازمی ہے ۔ تعلیم اس حوالے سے بھی بڑی اہم خدمت انجام دیتی ہے ۔ یہ معاشرہ میں اجتماعی شعور کی نشوونما کرتی ہے ۔ افراد میں قومی مفادات سے آگاہی اور ان کے تحفظ کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور انھیں بین الاقوامی رجحانات سے روشناس کراتی ہے ۔ اس طرح تعلیم یافتہ افراد کی شعوری شرکت سے سیاسی عمل جاری رہتا ہے اور رفتہ رفتہ بڑھتا رہتا ہے۔ دنیا میں سیاسی نظاموں کے ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں تعلیمی ترقی کا دور دورہ ہوتا گیا وہاں سیاسی ارتقا کے نتیجے میں قبائلی نظام سے جاگیردارانہ نظام اور پھر جمہوری نظام قائم ہوتا چلا گیا۔ غور سے دیکھا جائے اور انصاف سے کام لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ دنیا میں رائج نظاموں میں سے جمہوری نظام ہی دراصل بنی نوع انسان کے شایان شان ہے ۔ یہ نظام تعلیم ہی کے نتیجے میں قائم ہو سکتا ہے ۔ اس کے برعکس آمرانہ نظام جہالت ہی کے ماحول میں چل سکتا ہے چنانچہ جرمنی کے مشہور ڈکٹیٹر ہٹلر کا یہ مقولہ بڑا مشہور ہے کہ 'تعلیم میرے جوانوں کے لیے زہر ہے' واقعی تعلیم آمریت کی دشمن ہے کیونکہ آمریت انسانیت کی دشمن ہے ۔ تعلیم احترام آدمیت کی علمبردار ہوتی ہے اور احترام آدمیت آزادئ حقوق کا تقاضا کرتا ہے جو ایک اچھے جمہوری سیاسی نظام ہی میں پورا ہو سکتا ہے ۔ گویا تعلیم کے ذریعے ہم معاشرے میں ایک صحت مند سیاسی نظام قائم کر سکتے ہیں، جو بذاتِ خود بھی بڑا مبارک مقصد ہے اور پھر ظاہر ہے کہ ایسا نظام بالآخر معاشی خوشحالی کا ذریعہ بھی ثابت ہو گا ۔

مشقی سوالات

1 ۔ مدرسہ ایک معاشرتی مرکز ہے ۔ اس سے کس طرح تعلیم میں مدد لی جا سکتی ہے ؟

2 ۔ مدرسہ کس طرح کسی قوم کے تہذیبی ورثے کی منتقلی اور اس کے تحفظ کا ذریعہ بن سکتا ہے ۔

3 ۔ مدرسے کے ان ذرائع پر مختصر نوٹ لکھیے جو تعلیمی عمل میں معاون ثابت ہوتے ہیں ۔

4 ۔ معاشرے کے مستقبل کا انحصار تعلیم اور معاشرے کے باہمی تعامل پر ہے۔ بحث کیجیے ۔

5 ۔ افرادی قوت اور تعلیم کے باہمی تعلق پر مفصل نوٹ لکھیے ۔

6 ۔ کسی معاشرے کی غربت کا مسئلہ معاشی سے زیادہ تعلیمی مسئلہ ہے۔بحث کیجیے ۔

7 ۔ تعلیمی سرمایہ کاری سے حاصل شدہ منافع دیرپا اور مستقل ہوتا ہے ۔ دلائل سے ثابت کیجیے ۔

8 ۔ تعلیم کے مادی فوائد پر نوٹ لکھیے ۔

9 ۔ تعلیم کے تہذیبی فوائد تفصیل سے بیان کیجیے ۔

10 ۔ ذیل میں دیے گئے بیانات میں سے کچھ صحیح ہیں اور کچھ غلط ۔ اگر بیان صحیح ہے تو 'ص' کے گرد اور اگر غلط ہے تو 'غ' کے گرد دائرہ لگائیے :

i ۔ گھریلو ماحول بچے کی تعلیم و تربیت میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے ۔ ص غ

ii ۔ اہم نصابی سرگرمیاں تعلیمی عمل میں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کا اثر طلبہ کی شخصیت پر کم ہی پڑتا ہے ۔ ص غ

iii ۔ معلم کا ذاتی کردار خواہ کیسا ہی ہو ۔ طلبہ کا تعلق صرف درسی کتب سے ہوتا ہے ۔ ص غ

iv ۔ معلمین کے ذاتی اختلافات کا اثر مدرسے کی
مجموعی کارکردگی پر پڑتا ہے ۔ ص غ

v ۔ عموماً ایک غریب گھر کا بچہ امیر گھرانے کے
بچے سے ذہنی طور پر کمتر ہوتا ہے ۔ ص غ

vi ۔ تعلیمی سرمایہ کاری کا پھل جلد حاصل نہیں ہوتا
یہ ایک طویل اور صبر آزما سلسلہ ہے ۔ ص غ

vii ۔ اقتصادی ترقی کے لیے بنیادی ضرورت مادی وسائل
ہیں جب کہ ثانوی حیثیت تعلیم کو حاصل ہے ۔ ص غ

viii ۔ تعلیم کا بنیادی مقصد صرف اپنی
روزی کا حصول ہے ۔ ص غ

ix ۔ مقاصد تعلیم اور تعلیمی منصوبہ بندی ایک ہی
سلسلے کی دو کڑیاں ہیں ۔ ص غ

11 ۔ ذیل میں ہر سوال کے چار ممکنہ جوابات دیے گئے ہیں ۔ جن میں سے صرف ایک جواب صحیح ہے ۔ آپ صحیح جواب کے نمبر کے گرد دائرہ لگائیں ؟

i ۔ وہ کونسا عنصر ہے جو فرد کا سماجی منصب متعین کرتا ہے ؟
(الف) دولت (ب) خاندان (ج) تعلیم (د) ذات

ii ۔ کسی بھی معاشرے کی تعمیر و ترقی کا سب سے اہم ذریعہ اس معاشرے کے / کی
(أ) معاشی وسائل ہیں (ب) افرادی قوت ہے
(ج) جغرافیائی حالات ہیں (د) تعلیمی منصوبہ بندی ہے ۔

iii ۔ معاشرے میں غربت کا مسئلہ درحقیقت
(أ) معاشرتی مسئلہ ہے (ب) معاشی مسئلہ ہے
(ج) تعلیمی مسئلہ ہے (د) سیاسی مسئلہ ہے

iv ۔ تعلیمی سرمایہ کاری
(ا) ایک غیر نفع بخش کاروبار ہے ۔ (ب) کا فائدہ صرف اساتذہ کو ہوتا ہے ۔
(ج) کے بغیر اقتصادی ترقی ممکن ہی نہیں ۔ (د) صرف حکومت وقت کی ذمہ داری ہے ۔

تعلیم کی نفسیاتی بنیادیں

نفسیات اور اس کا تعلیمی دائرۂ کار:

نفسیات انسانی فطرت ، ذہن اور اس کے طرز عمل کے مطالعے کا علم ہے ۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کے علاوہ تعلیم کے میدان میں اس کا اطلاق بڑا مفید ہوتا ہے مثلاً اس کی مدد سے متعلم کی فطرت ، ضرورت ، دلچسپی اور صلاحیت سے شناسائی حاصل کی جاتی ہے ۔ اس کا دوسرا پہلو خود عمل تعلیم کی ماہیت کا مطالعہ ہے ۔ نفسیات کی مدد سے اس عمل کی حقیقت معلوم کر لی جائے تو تعلیم کو فروغ دیا جا سکتا ہے ۔ اسی طرح متعلم کی فطرت اور تعلیم کی ماہیت کے مطالعے سے تعلیمی عمل اور تعلیمی نظام کی تنظیم و تشکیل کے لیے نفسیات اہم اساس کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے ۔ تعلیم دراصل افراد کی متوازن نشوونما کا نام ہے ۔ عمل تعلیم کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ زیرِ تعلیم افراد کی نفسیاتی ضرورتوں ، صلاحیتوں اور مسائل سے ہم آہنگ ہو ۔

گو قدرت نے ہر انسان کو ایک منفرد شخصیت بنا کر بھیجا ہے لیکن گھر ، ماحول اور معاشرہ سبھی اس کی شخصیت کو ایک مخصوص قالب میں ڈھالنے کا باعث بنتے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں ماحول کے زیر اثر بچے میں ایک خاص قسم کا کردار پیدا ہوتا ہے جو بچے کے ظاہری اعمال ، باطنی کیفیات اور ماحول کے زیر اثر مرتّب ہونے والے رد عمل پر مشتمل ہوتا ہے ۔ چونکہ کسی مدرسے میں آنے والے طلبہ مختلف گھرانوں اور معاشروں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے مختلف شخصیتوں کے حامل ہوتے ہیں ۔ ان کی ذہنی سطح ، ذاتی کردار ، معاشرتی اور جذباتی مسائل بھی مختلف ہوتے ہیں ۔ ایسے مسائل میں سے انفرادی اختلافات کے مسائل ، تدریسی طریقوں کی مشکلات ، نظم و ضبط اور طلبہ کی معاشرتی نشوونما کے مسائل ، جماعت کی

تنظیم اور اس میں نظم و نسق برقرار رکھنے کے مسائل زیادہ اہم ہیں ۔ تعلیمی عمل کے دوران استاد کے سامنے جو بھی مسائل آسکتے ہیں ان سب کے حل کے لیے علم نفسیات مؤثر رہنمائی فراہم کر سکتا ہے۔

تعلیم کا عمومی مقصد بچے کو آئندہ زندگی میں کامیابی کے تیار کرنا ہے نفسیات کے ذریعے ہمیں بچے کی ذہنی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے اور اس طرح حالات کے مطابق تعلیم دینے کے قابل ہو جاتے ہیں ۔ جس کے بعد طلبہ کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے بہتر طور سے تعلیم دی جاسکتی ہے۔ نفسیات کے ذریعے ہمیں اس بات کا علم بھی ہو جاتا ہے کہ تدریس کے دوران کسی خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کن نفسیاتی پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جائے۔

طلبہ کی ایک جماعت منفرد شخصیتوں کا مجموعہ ہوتی ہے ۔ اور پھر یہ سب منفرد نفسیاتی مسائل رکھتے ہیں ۔ اس صورت حال میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مختلف ماحول سے تعلق رکھنے والے مختلف شخصیت کے حامل افراد کو ایک ہی وقت میں ایک ہی کمرۂ جماعت میں کیسے تعلیم دی جائے تاکہ وہ موثر اور بارآور ثابت ہو ۔ اس صورتِ حال میں نفسیات پھر ہماری مدد کرتی ہے ۔ علمِ نفسیات کے مطالعے سے ہم فرد اور اس کے طرز عمل کا فہم حاصل کر سکتے ہیں ۔ نفسیات مختلف عمر کے افراد کے ذاتی اور گروہی ردِ عمل کے سائنسی مطالعے کے ذریعے یہ اخذ کرتی ہے کہ افراد کی اکثریت خاص حالتوں میں خاص مواقع پر یکساں ردعمل کا مظاہرہ کرتی ہے ۔ ماہر نفسیات کے ایسے نتائج اور نظریات تعلیمی عمل میں بچّے کے کردار کو سمجھنے اور اس کے متعلق پیش گوئی کرنے میں نہایت مفید ثابت ہوتے ہیں ۔ نفسیات کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ استثنائی بچوں کے انفرادی مسائل کا مطالعہ کر کے ان کے مسائل کو حل کرتی ہے اور اس طرح طلبہ کے تعلیمی عمل کو کامیاب بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے ۔

نفسیات سے واقف استاد بچّے کی فطرت اور طبعی رجحان کو پیش نظر رکھ کر اسے ایسا تعلم فراہم کر سکتا ہے جو اس کے لیے بامعنی ہو ۔ اس طرح بچّے کی دلچسپی کی وجہ سے تعلم موثر ہو گا ۔ اس کے برعکس علمِ نفسیات سے ناواقفیت کی وجہ سے ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ استاد بچّے کو ایسے وقت اور ماحول میں کچھ سکھانا چاہے جب بچہ ذہنی طور پر تیار نہ ہو ۔ اس طرح بچّے کے ذوق و شوق کے فقدان کی وجہ سے تعلم مؤثر نہ ہو گا اور یوں معلم اور متعلم

دونوں کا وقت ضائع ہو گا۔

نفسیات تعلیم کے عمل کو سمجھنے اور اس کو موثر بنانے میں مدد دیتی ہے۔ تعلم کیسا ہونا چاہیے؟ تعلم کے لیے بچّہ کس حالت میں آمادہ ہوتا ہے؟ اس میں مدد دینے والے عوامل کون سے ہیں اور رکاوٹ پیدا کرنے والے عناصر کون کون سے ہیں؟ تعلم کو کیسے پائدار بنایا جا سکتا ہے؟ یہ سب ایسے سوال ہیں جن کے جوابات نفسیات کے ذریعے ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

نفسیات بچّوں کی دلچسپیاں سائنسی تحقیق کی بنیاد پر معلوم کرتی ہے اور ان کے مطالعہ کے لیے مہارتیں اور طریقے وضع کرتی ہے۔ اس طرح نفسیات تعلیمی نصاب اور متعلم کے لیے اضافی مطالعاتی مواد کو سائنسی بنیادوں پر متعین کر کے تعلیمی عمل کو مفید اور موثر بنانے میں مدد دیتی ہے۔ تعلیمی عمل کہاں تک موثر ہوا؟ تعلیم کے عمل کے بعد تعلیمی مقاصد کے حصول میں کہاں تک کامیابی ہوئی؟ تعلیم کے موثر ہونے میں اگر کچھ رکاوٹیں حائل ہوئیں تو وہ کیا تھیں؟ ایک ہی تعلیمی عمل سے گزر کر مختلف طلبہ میں جو علمی فرق رہ جاتا ہے، اس کی وجوہات کیا ہیں؟ تعلیمی طور پر متوسط اور پیچھے رہ جانے والے طلبہ کی علمی استعداد کو کیسے بڑھایا جا سکتا ہے؟ یہ ایسے مسائل ہیں جس کے جاننے میں نفسیات ہماری مدد کرتی ہے۔

فرد کی نشوونما کے اصول اور اس پر اثرانداز ہونے والے عوامل تعلیم میں بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ زیرِ تعلیم بچے نشوونما کے عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ اس عمل کے دوران میں ان کے تجربات مختلف ہوتے ہیں۔ نشوونما کے عملی مدارج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ جیسے بالک پن، لڑکپن، نو بلوغ اور بلوغت۔ ان میں سے ہر مرحلے کے اپنے مخصوص تقاضے ہوتے ہیں۔ نفسیات ایسے تعلیمی تقاضوں کی نشاندہی کرتی ہے اور تعلیم کے لیے ایسے اقدام تجویز کرتی ہے جو نشوونما کے خاص مدارج میں مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔

نشوونما اور اس کے تعلیمی تقاضے

بچّے قدرت کا عطیہ ہیں ۔ ان کی پرورش اور نگہداشت ایک اہم ذمّے داری ہے ۔ بچے کی نشوونما میں والدین کا کردار بنیادی حیثیت کا حامل ہے ۔ حدیث میں آیا ہے کہ ہر بچّہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی ، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں ۔ اس سے بچّے کی ابتدائی ماحول کی اہمیت واضح ہوتی ہے ۔ اس ابتدائی ماحول کے بعد گلی ، کوچہ ، محلہ ، گاؤں ، شہر ، مدرسہ ، استاد ، دوست اور کھیل کے ہمجولی ، موسم اور آب وہوا سبھی بچّے کی شخصیت بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔

نشوونما کا مفہوم :

ماحول اور عمر کے اضافے کے ساتھ ساتھ انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ، انھیں 'نشوونما' کہتے ہیں ۔ نشوونما ایک جامع عمل ہے ۔ اس میں بچّے کے جسمانی ، ذہنی ، معاشرتی اور جذباتی پہلوؤں کی ہم گیر تبدیلیاں شامل ہوتی ہیں ۔ نفسیاتی اعتبار سے بچے کی نشوونما کا تعلق توارث سے بھی ہوتا ہے اور ماحول سے بھی ۔

نشوونما اور توارث :

توارث سے مراد کسی خاصیت کا نسل در نسل منتقل ہونا ہے ۔ ماہرینِ نفسیات میں اس امر پر اختلاف تو پایا جاتا ہے کہ توارث اور ماحول میں سے زیادہ اہم کون سا عنصر ہے ۔ بہر حال دونوں کی اثراندازی ایک مسلمہ نفسیاتی حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے ۔ بچّے کی شخصیت پر اس کے آباؤ اجداد کے خدوخال اور عادات و اطوار کا بھی اثر ہوتا ہے اور یہ اثر پیچھے کئی پشتوں سے منتقل ہو کر آ سکتا ہے۔

نشوونما اور ماحول:

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ماحول بچّے کی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں دو ایسے جڑواں بھائیوں کی مثال دی جاتی ہے جو توارث کے لحاظ سے بالکل یکساں تھے لیکن انھیں نشوونما کے لیے الگ الگ ماحول فراہم کیا گیا تھا۔ پرورش کے بعد تقابل سے ثابت ہوا کہ ایسے دونوں بھائیوں میں توارث کے اشتراک کے باوجود نشوونما کے مختلف پہلوؤں میں واضح اختلاف پایا جاتا تھا اور دونوں میں اپنے اپنے ماحول کے اثرات نمایاں تھے۔

نشوونما کے اصول:

نشوونما بڑا پیچیدہ عمل ہے۔ تعلیمی عمل میں اس کی اہمیت کی وجہ سے بہرحال اس کا فہم بڑا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں ان اصولوں سے بڑی رہنمائی ملتی ہے جنھیں ماہرین نفسیات نے اپنی تحقیق کے ذریعے وضع کیا ہے۔

یہ اصول مندرجہ ذیل ہیں:-

1۔ نشوونما ایک مسلسل عمل ہے: یہ عمل بچّے کی پیدائش کے بعد سے برابر جاری رہتا ہے۔ بعض پہلوؤں میں اس کے اثرات صاف نظر آتے ہیں جیسے جسمانی پہلو۔ جہاں محسوس طور سے اس کے اثرات نظر نہ آرہے ہوں وہاں بھی دراصل یہ عمل جاری ہوتا ہے۔

2۔ نشوونما ایک تخلیقی عمل ہے: اس عمل میں ایک درجہ بندی پائی جاتی ہے۔ مثلاً جسمانی نشوونما میں بچّہ پہلے بیٹھنا سیکھتا ہے پھر کھڑا ہونا اور اس کے بعد چلنا سیکھتا ہے۔

3۔ مختلف بچوں میں نشوونما کی رفتار مختلف ہوتی ہے: توارث اور ماحول کے فرق کی وجہ سے ایک ہی عمر کے مختلف بچوں میں جسمانی یا ذہنی یا کسی دوسرے پہلو میں نشوونما کی رفتار مختلف ہو سکتی ہے۔

4 ۔ کسی ایک بچّے میں نشوونما کے مختلف پہلوؤں کی رفتار مختلف ہو سکتی ہے : ایسا ہو سکتا ہے اور اس کی مثالیں روزمرہ زندگی میں سامنے آتی رہتی ہیں کہ کسی بچّے کی جسمانی نشوونما کی رفتار اس کی ذہنی نشوونما سے بہتر ہے یا اس کی لسانی نشوونما اس کی جسمانی نشوونما سے بہتر ہوتی ہے ۔

5 ۔ نشوونما ایک مربوط عمل ہے : اس عمل کے مختلف پہلوؤں اور مدارج میں ایک ربط پایا جاتا ہے ۔

6 ۔ لڑکوں اور لڑکیوں میں نشوونما کی رفتار قدرے مختلف ہوتی ہے : لڑکیوں میں دور نو بلوغ میں جسمانی نشوونما کی رفتار لڑکوں کی بہ نسبت تیز ہوتی ہے ۔ اس طرح لسانی نشوونما میں بھی لڑکیوں کی رفتار لڑکوں سے بہتر ہوتی ہے ۔

نشوونما کے مدارج اور ان کے تعلیمی تقاضے

بچّوں کی نشوونما کا سلسلہ پیدائش سے شروع ہو کر بلوغت تک جاری رہتا ہے ۔ نشوونما سے مراد وہ تمام تغیرات ہیں جو کسی فرد میں اس عرصے کے دوران میں رونما ہوتے ہیں ۔ سادہ لفظوں میں نشوونما ان تمام جسمانی ، ذہنی ، معاشرتی اور جذباتی تبدیلیوں کا باضابطہ مطالعہ ہے ، جو بچّوں میں تجربوں ، حادثوں ، تعلیم و تربیت وغیرہ کے نتیجے کے طور پر رونما ہوتی رہتی ہے ۔ بچّوں کا تخیل ، کردار اور شخصیت ان تبدیلیوں سے مختلف طریقوں سے متاثر ہوتا ہے ۔ والدین اور اساتذہ کے لیے ان سب تبدیلیوں کا جاننا ضروری ہے ۔

نشوونما کے مدارج حسب ذیل ہیں :-

1 ۔ طفولیت (پیدائش سے پانچ سال کی عمر تک)

2 ۔ لڑکپن (پانچ سال سے نوبلوغت تک)

3 ۔ نوبلوغت (12 ، 13 سال سے بلوغت تک)

4 ۔ بلوغت (تقریباً 19 سال کی عمر سے لے کر)

طفولیت:

طفولیت کا دور پیدائش سے لے کر تقریباً چار یا پانچ سال تک ہوتا ہے۔ اس دور کی نمایاں خصوصیات ذیل میں پیش کی گئی ہیں:

جسمانی نشوونما:

پیدائش کے بعد اس دور میں جسمانی نشوونما کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ اس دور میں لڑکے عموماً لڑکیوں کی بہ نسبت قدرے لمبے اور بھاری نظر آتے ہیں۔ بچہ جسم پر قابو پانا اور بیٹھنا، اٹھنا اور چلنا وغیرہ تمام بنیادی مہارتیں سیکھتا ہے۔ اس دور میں بچہ والدین کی وجہ سے تحفظ محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا اس دور میں بچوں کے ساتھ محبت اور ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس دور میں قد کی نشوونما بڑی نمائندہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی روشنی میں بچے کے مستقبل کے قد کے بارے میں پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔

ذہنی نشوونما:

اس دور کی ابتدا میں بچہ زیادہ تر تخیل اور حواس خمسہ پر انحصار کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ دور اور نزدیک، چھوٹے اور بڑے، روشنی اور اندھیرے، رنگوں اور آوازوں کا کچھ شعور حاصل کر لیتا ہے۔ اس میں توجہ کو مرکوز کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ لسانی مہارتوں میں حیرت انگیز ترقی ہوتی ہے۔ ذخیرہ الفاظ کے اضافے اور ان کی بار بار تکرار سے بچہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق چھٹے سال تک بچے کا ذخیرہ الفاظ 2562 ہو جاتا ہے اور پھر وہ ان الفاظ کو فقروں میں استعمال کرنا بھی سیکھ لیتا ہے۔

جذباتی نشوونما:

شروع میں بچہ اپنی خواہشات اور جذبات کا اظہار اشاروں، آوازوں اور جسمانی حرکات

سے کرتا ہے ۔ اس دور میں ڈر اور خوف کے جذبات بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور تحفظ کا احساس اور اس سے متعلق احتیاط کی تربیت بھی شروع ہو جاتی ہے ۔ لیکن جذبات میں ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچّہ ہنس رہا ہے اور ذرا سی دیر میں وہ رونے لگ جاتا ہے ۔ ابھی روٹھا ہوا نظر آ رہا ہے اور پھر تھوڑی دیر میں خود ہی مان جاتا ہے ۔

معاشرتی نشوونما:

پیدائش کے بعد بچّے کا افراد کنبہ سے رابطہ قائم ہوتا ہے تو وہ معاشرتی زندگی کا آغاز کرتا ہے ۔ اس کے معاشرے میں گلی اور محلہ شامل ہو جاتے ہیں ۔ اس دور میں بچّہ اپنی بنیادی ضرورتوں کے پورا کرنے میں دوسروں کا محتاج ہوتا ہے ۔ ایک تحقیق کے مطابق تمام بنیادی معاشرتی رویے اس دور میں تشکیل پاتے ہیں ۔ بچّے دوستانہ اور غیر دوستانہ رویوں میں امتیاز کرنے لگتے ہیں ۔ اس دور میں پالتو جانور ، شوخ رنگ کی اشیاء اور کھلونوں میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے ۔ اس دور میں بچّے موسیقی اور مظاہر فطرت میں بھی دلچسپی لینے لگتے ہیں ۔

ایک ماہر نفسیات کے مطابق نفسیاتی اعتبار سے اس عمر کے بچّے عام طور پر مندرجہ ذیل باتیں سیکھتے ہیں :۔

1 ۔ چلنا ، کھانا اور بولنا ۔

2 ۔ ضروری حوائج پر قابو پانا ۔

3 ۔ جنس میں امتیاز کرنا اور شرم و حیا کرنا ۔

4 ۔ اپنی حرکات پر قابو پانا ۔

5 ۔ جسمانی اور معاشرتی حقائق کے بنیادی تصورات ۔

6 ۔ دوسروں سے تعلقات قائم کرنا ۔

7 ۔ غلط اور درست کی پہچان اور ضمیر کی نشوونما ۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ بچّے کی زندگی کا یہ دور تربیت کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ بچّے کی آئندہ زندگی اور تعلیم و تربیت کا انحصار اسی پر ہے ۔

لڑکپن

یہ دور پانچ سال کے لگ بھگ شروع ہو کر گیارہ سال کی عمر تک جاری رہتا ہے۔ بچہ گھر سے باہر نکل کر معاشرے اور مدرسے کے زیرِ اثر آجاتا ہے۔ اس دور کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:

جسمانی نشوونما:

اس دور میں بچّے کی جسمانی نشوونما مسلسل جاری رہتی ہے ۔ چھے سال کی عمر میں بچّے کے دماغ کا وزن اس کے دور بلوغت کے دماغ کا 90 فیصد ہو جاتا ہے ۔ اس کی ہڈیاں لمبی اور پختہ ہو جاتی ہیں ۔ عضلات کی نشوونما میں بھی نمایاں اضافہ ہوتا ہے ۔ اس عمر میں جسمانی کام کرنے کا بھی شوق ہوتا ہے لہٰذا تیزی و طراری مستعدی اور چالاکی میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے

ذہنی نشوونما:

اس دور میں بچّے کا ذہن سوچ بچار کی طرف مائل ہوتا ہے ۔ وہ ماحول پر غور کرتا ہے ، مشاہدات سے نتائج اخذ کرتا ہے اور پھر ان نتائج کا روزمرہ زندگی پر اطلاق کرتا ہے ۔ بچّے کا حافظہ تیز ہو جاتا ہے ۔ پڑھنے میں شوق بڑھتا ہے اور زباندانی میں قابل قدر اضافہ ہوتا ہے ۔ اس دور کے آخر تک پہنچتے پہنچتے بچّے میں اپنی انفرادیت کا احساس نمایاں ہو جاتا ہے ۔

جذباتی نشوونما:

اس دور میں بچہ زیادہ حساس ہو جاتا ہے ۔ اس میں رشک اور حسد کے جذبات بھی پیدا ہو جاتے ہیں ۔ وہ جسمانی حفاظت اور خاندانی پابندیوں سے آزاد ہونا چاہتا ہے ۔ پسندیدگی کی خواہش اور محبت کی ضرورت محسوس کرتا ہے ۔ جذباتی طور پر بچّے کے سیکھنے کی یہ صحیح عمر ہوتی ہے ۔ ملکیت کی خواہش اور تقلید کا میلان بالعموم اس عمر میں ظاہر ہوتا ہے ۔

معاشرتی نشوونما:

اس زمانے میں بچّے کے معاشرتی ماحول میں بہت اضافہ ہوتا ہے ۔ ہم جماعتوں اور ہمجولیوں کے علاوہ اساتذہ سے بھی رابطہ پیدا ہوتا ہے ۔ بچّے گروہ بندی کی طرف مائل ہوتے

ہیں اور اپنے لیے دوستوں اور لیڈروں کے انتخاب کا فیصلہ کرنے لگتے ہیں ۔ اس طرح ان میں تعاون ، مسابقت اور قیادت کی صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں ۔ بچے میں قوانین اور احکام کا احترام پیدا ہوتا ہے ۔ اس دور میں بچوں میں جنسی شعور زیادہ واضح ہونے لگتا ہے ۔

نفسیاتی اعتبار سے اس دور میں بچوں کے تعلم میں درج ذیل امور شامل ہونے چاہئیں:

1 ۔ کھیل کود اور عام کاموں میں جسمانی مہارت حاصل کرنا ۔
2 ۔ ذاتی شعور کی نشوونما ۔
3 ۔ اپنے ہم عمروں کے ساتھ میل جول رکھنا ۔
4 ۔ اپنی جنس سے متعلق کام کرنے سیکھنا ۔
5 ۔ لکھنے پڑھنے اور ریاضی کے بنیادی اور عام فہم اصولوں کی مہارت حاصل کرنا ۔
6 ۔ ضمیر ، اخلاق اور دوسری قدروں کی نشوونما کرنا ۔
7 ۔ روزمرہ زندگی کے لیے ضروری تصورات سیکھنا ۔
8 ۔ معاشرے اور ملک کے متعلق مناسب اندازے قائم کرنا ۔

دورِ نو بلوغت

اس دور کا آغاز بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہوتا ہے اور تقریباً انیس سال تک جاری رہتا ہے ۔ اس میں نشوونما کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں :۔

جسمانی نشوونما:

جسمانی نشوونما میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ۔
مختلف اعضا اور قد میں بڑی سرعت سے تبدیلی واضح ہوتی ہے ۔ اس دور کے

اختتام تک لڑکے جسمانی ساخت کے اعتبار سے مردوں کی طرح اور لڑکیاں عورتوں کی طرح نظر آنے لگتی ہیں ۔ لڑکپن کی آواز میں تبدیلی رونما ہوتی ہے ۔ اس دور میں رونما ہونے والی جسمانی اور جنسی تبدیلیوں کی وجہ سے بچوں میں ایک ذہنی ہیجان کی کیفیت پائی جاتی ہے ۔

جذباتی نشوونما:

جذباتی اعتبار سے یہ سخت ہیجان کا دور ہوتا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ موقع محل کے مطابق جذبات کے اظہار کا طریقہ سمجھنے لگتے ہیں ۔ کیونکہ وہ جان چکے ہوتے ہیں کہ غصے اور خوف کے جذبات میں بے قابو ہونا ناپسندیدہ ہے اور اس کی وجہ سے ان کا مذاق اڑایا جا سکتا ہے ۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ خوف کا عنصر بھی رفتہ رفتہ کم ہو جاتا ہے اور اب وہ کتوں بلیوں ، کیڑوں یا بھوت پریت سے زیادہ نہیں ڈرتے ۔

معاشرتی نشوونما:

محبت ، نفرت ، حسد ، غصے اور خوف کے جذبے اس دور کے بچے کی معاشرتی زندگی میں ایک ہیجان آمیز کیفیت پیدا کرتے ہیں ۔ گروہی وفاداریاں بھی شدت سے ابھرنے لگتی ہیں ۔ اس دور میں جنسی میلانات کی شدت کی وجہ سے کئی پیچیدہ معاشرتی مسائل پیدا ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس دور میں ہم نصابی مشاغل کی مناسب تنظیم کے ذریعے ان کی ضرورتوں اور صلاحیتوں کو مفید معاشرتی معاملات میں کام میں لایا جا سکتا ہے ۔

دورِ بلوغت

یہ دور انیس سال کی عمر کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے ۔ اس دور کی نمایاں نشوونمائی خصوصیات حسب ذیل ہیں :۔

جسمانی نشوونما:

اس دور میں جسمانی نشوونما کو نمایاں خصوصیت حاصل ہے کیونکہ چہرے کے اعضا کا تناسب بدل جاتا ہے اور دوسری جسمانی تبدیلیاں بھی واقع ہونی شروع ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے ایک لڑکا اچھا خاصا مرد اور لڑکی ایک خاتون نظر آنے لگتی ہے۔ اس عمر میں شکل و صورت رفتار و گفتار کے لحاظ سے ہر چیز میں نمایاں فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔

ذہنی نشوونما:

بچّہ اس عمر تک پہنچتے پہنچتے ذہنی طور پر ترقی کے مدارج طے کر چکا ہوتا ہے۔ ماہرین نفسیات کے مطابق اس کے بعد انسانی ذہن مزید ترقی نہیں کرتا۔ اس دور میں غور و فکر کرنے اور خود فیصلہ کرنے کا رجحان نمایاں ہوتا ہے لہذا بچّہ دوسروں سے توقع کرنے لگتا ہے کہ وہ اس کی رائے کا احترام کریں۔ ذہنی طور پر وہ شادی کی زبردست خواہش رکھتا ہے۔ اس خواہش کے پورا نہ ہونے کی صورت میں ذہنی طور پر بے راہ روی کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ ذہنی پختگی کی وجہ سے سنجیدہ کتب اور مواد کے مطالعے کا رجحان نمایاں ہوتا ہے۔

معاشرتی نشوونما:

اس دور کا معاشرتی تقاضا ہے کہ وہ دوسروں کی رائے کا احترام کرے۔ جمہوری اقدار کو اپنائے اور دوسروں کو بھی جمہوریت کی تلقین کرے۔ اسلامی نظریۂ حیات کے حوالے سے ایک مسلمان فرد کا یہ ایک لازمی خاصہ ہونا چاہیے کہ وہ قومی سطح سے آگے بڑھ کر عالمی اخوت کے حوالے سے اپنے طرزِ عمل کا اظہار کرے۔

جذباتی نشوونما

بلوغت کی حد میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی بچّے کے پرانے خوف اکثر ختم ہو چکے ہوتے ہیں۔ لیکن اس دور کے آغاز کے ساتھ ہی کچھ نئے مسائل کا آغاز ہو جاتا ہے مثلاً مستقبل کا تحفظ، شادی کا مسئلہ، ذاتی تشخص کی حفاظت وغیرہ۔ مخالف جنس کی طرف فطری

رغبت شدت اختیار کر جاتی ہے ۔ شادی کی خواہش بھی زور پکڑ جاتی ہے ۔ ان جذبات کو مناسب راہنمائی کے ذریعے اعتدال پر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ اپنے جائز حقوق کا تحفظ بھی کر سکے اور معاشرے کی بہبود و ترقی کے کام بھی آ سکے ۔ جہاں عملی زندگی میں ان خواہشات اور آرزوؤں کی تکمیل ہوتی ہے وہاں چند افراد میں ان کے عدم حصول کی وجہ سے جذباتی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا خطرہ بھی ہوتا ہے ۔

نشوونما کی تعلیمی اہمیت

بچوں کی نشوونما کی تعلیمی اہمیت مسلم ہے ۔ معلم کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کی نشوونما کے مختلف مدارج کی خصوصیات اور ضروریات سے واقفیت حاصل کرے اور ان کے حوالے سے تعلیم کے عمل کو مؤثر بنائے ۔ مختلف عمروں میں بچوں کی ذہنی صلاحیتوں سے واقفیت کی بنا پر معلم اپنے معیار تعلیم ، طریق تدریس اور عام طرزِ عمل کو اس نہج پر رکھ سکتا ہے جو بچوں کے فہم و ادراک کے مطابق ہو ۔ بچوں کے انفرادی مسائل کو سمجھنا فن تدریس میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ اس سلسلے میں بھی نشوونما کے اصولوں ، نشوونما کی مرحلہ وار کیفیات اور ان کے تقاضوں کا علم معلم کے تدریسی عمل میں اہم معاون ثابت ہو سکتا ہے ۔

تعلم

تعلم کردار کی اس تبدیلی کا نام ہے جو محض پختگی کا نہیں بلکہ فرد کے اپنے تجربات کا نتیجہ ہو ۔

اس تعریف کو غور سے دیکھا جائے تو تعلم کی یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ جب تک فرد کسی تجربے سے دوچار نہ ہو تو اسے تعلم حاصل نہیں ہو گا ۔ اس اعتبار سے تحریک کو تعلم میں بنیادی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ تجربہ تحریک ہی کا نتیجہ ہوتا ہے یعنی حالات اور اس کی قوتیں فرد کو تحریک دیتے ہیں کہ وہ کسی ردِ عمل کا اظہار کرے ۔ جس ردعمل کا تجربہ خوشگوار ہو فرد اسے بار بار دہراتا ہے اور تکرار کے اس عمل سے اس میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے

اور ہم اسے کرداری تبدیلی سے موسوم کرتے ہیں۔

تعلم کی شرائط

معلم تعلیم دیتا ہے لیکن بعض اوقات اس کی تدریس کے نتیجے میں تعلم موثر ہوتا ہے اور بعض اوقات غیر موثر۔ حالانکہ دونوں صورتوں میں معلم کی شخصیت وہی ہوتی ہے۔ دراصل تعلم معلم کے بجائے متعلم کا عمل ہے اور تعلم کے حصول اور عدم حصول کا اصل انحصار متعلم کی حالت پر ہے۔ تعلم کے لیے مناسب حالات کو تعلم کے عوامل یا شرائط کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

1 ۔ آمادگی :

ماہرین نفسیات کے مطابق جب تک کوئی بچہ پڑھنے کے لیے آمادہ نہیں ہو گا اس پر کوئی تعلم موثر ثابت نہیں ہو سکتا۔ مختلف طلبہ میں آمادگی کی صلاحیت اور نوعیت مختلف ہوتی ہے، جس کی وجہ جسمانی، معاشرتی، ذہنی اور جذباتی نشوونما کے اختلافات ہو سکتے ہیں۔ آمادگی کے عمل کی سوجھ بوجھ سے معلم تعلم کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ مثلاً دور طفولیت میں بچہ زباندانی کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ لہذا اسے لسانی نشوونما کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ مجرد تصورات کے لیے بچے میں آمادگی نہیں پائی جاتی لہذا ان سے گریز کیا جائے۔

2 ۔ تحریک :

عمل تعلم کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ معلم طریق تدریس کے ذریعے متعلم کے لیے تحریک فراہم کرے کیونکہ تحریک کے بغیر انتقال علم مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ انعام، سرزنش اور شرمندگی کو تحریک کی مثالوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

3 ۔ دلچسپی :

تعلم میں دلچسپی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خود آمادگی تعلم اور تحریک تعلم کے علاوہ دلچسپی بھی ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً متعلم کو

احساس ہو کہ مواد تعلم اس کے لیے مفید ہے یا معلم کا طرزِ عمل خوشگوار ہو تو یہ امور متعلم کی دلچسپی بڑھانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں ۔

4 ۔ توجہ:

تعلم میں توجہ اور انہماک کے عناصر کو مرکزی اہمیت حاصل ہے ۔ توجہ کے بغیر کسی قسم کا کوئی تعلم ممکن نہیں ۔ مثلاً ایک طالب علم کمرۂ جماعت میں بیٹھا ہو مگر اس کا دھیان کہیں اور ہو تو توجہ کے فقدان کی وجہ سے بظاہر تعلم کے عمل میں شرکت کے باوجود وہ تعلم سے عاری رہے گا ۔

5 ۔ مشق:

کامیاب تعلم کی ایک اور شرط مشق ہے ۔ خصوصاً تعلم کو پختہ کرنے کے لیے مشق اور تکرار ضروری ہے ۔ مشق سے مراد رٹنا نہیں بلکہ اس سے مراد کسی مواد کو اچھی طرح سمجھ کر بار بار دہرانا مثلاً زباندانی میں بچے کو اگر کوئی نئی ساخت سکھائی گئی ہو تو اس تعلم کو موثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اعادے کی مناسب مثالیں اور مواقع فراہم کیے جائیں ۔

6 ۔ تکان اور بوریت کا ازالہ

ذہنی اور جسمانی تازگی تعلم کے عمل کو موثر بناتی ہے جبکہ تکان اور بوریت تعلم کے متعلق منفی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے ۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم درس و واعظ میں وقفوں کا خاص اہتمام کیا کرتے تھے تاکہ متعلمین تعلم سے بیزار نہ ہو جائیں ۔ حدیث کی رو سے قرآن حکیم کی تلاوت بھی اس وقت معطل کر دینی چاہیے جب آدمی تکان محسوس کرنے لگے ۔

7 ۔ ذہانت:

ذہانت تعلم کی ایک بنیادی شرط ہے ۔ تعلم کی کامیابی کا انحصار بچے کی ذہنی سطح پر ہوتا ہے ۔ ذہانت کے اعتبار سے بعض بچے ادنیٰ ذہانت کے مالک ہوتے ہیں بعض متوسط اور بعض اعلیٰ ذہانت رکھتے ہیں جب کہ کچھ فطین بھی ہو سکتے ہیں ۔ مثلاً تجسس ، مشاہدہ ، واقفیت عامہ ، مطالعہ کا شدید شوق فطین بچوں کی نمایاں خصوصیات ہیں ۔ ان میں قائدانہ صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں اس قسم کے بچوں کو تعلیمی معاملات میں معمولی راہنمائی بھی کافی

ہوتی ہے۔

ادنیٰ ذہانت کے بچوں کا مقیاس ذہانت صفر سے 89 تک ہوتا ہے۔ اس قسم کے بچوں میں مخبوط العقل، فاتر العقل، ضعیف العقل، احمق اور کند ذہن بچے شامل ہوتے ہیں۔ اس قسم کے بچوں کے تعلم میں ان کی ذہانت کے درجے کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ ایسے بچوں کو بات دیر سے سمجھ آتی ہے لہٰذا معلم کی خصوصی توجہ کے مستحق ہوتے ہیں۔

متوسط ذہانت کے بچوں کا مقیاس ذہانت ۹۰ سے ۱۰۹ کے درمیان ہوتا ہے۔ اس قسم کے بچے متعلم کی رہنمائی میں مدرسے کی تعلیم سے خاطر خواہ استفادہ کر سکتے ہیں تاہم استاد کی خصوصی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اعلیٰ ذہانت کے بچوں کا مقیاس ذہانت ۱۱۰ سے ۱۱۹ کے درمیان ہوتا ہے اس قسم کے بچے معلم کی مسلسل رہنمائی اور دیکھ بھال کے بغیر بھی تعلم سے نمایاں استفادہ کر لیتے ہیں۔ فطین بچوں کا مقیاس ذہانت ۱۴۰ یا اس سے اوپر ہوتا ہے یہ بچے غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔

8 ۔ طبعی رجحان:

تعلم کی کامیابی کے لیے طبعی رجحان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً اگر کسی متعلم میں ریاضی پڑھنے کے لیے طبعی رجحان موجود ہو تو وہ اس کی تحصیل میں آسانی محسوس کرے گا جب کہ عدم رجحان کی صورت میں تعلم دشوار اور بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔

9 ۔ جذبات:

تعلم کی کامیابی کے لیے بچوں میں خوشگوار جذباتی کیفیات پیدا کرنا نہایت ضروری ہے مثلاً فرحت، مسرت اور طمانیت سے بچے میں تعلم موثر ہوتا ہے جب کہ ناسازگار جذباتی کیفیات مثلاً جذباتی کھچاؤ، تناؤ، اضطراب، پریشانیاں تعلم کو دشوار بنا دیتی ہیں۔

10 ۔ رویہ:

تعلم کی کامیابی کے لیے متعلم کا مثبت رویہ بھی نہایت اہم ہے۔ اگر متعلم عمل تعلم

میں توجہ اور دلچسپی کا اظہار کرے اور جسمانی طور پر بھی کام میں مستعدی کا ثبوت دے تو تعلم کا کام بہت آسان اور موثر ہو جاتا ہے ۔ اس کے برعکس متعلم کے نامناسب رویے سے تعلم کے لیے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں ۔ مثلاً اگر متعلم میں محنت کا رویہ ہو تو تعلم مؤثر ہو گا بصورتِ دیگر تعلم غیر مؤثر ہو گا ۔

11 ۔ موروثی پس منظر :

تعلم میں خاندانی حالات بھی بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ مثلاً غریب خاندان کے بچے اعلیٰ تعلیم کا بہت کم سوچتے ہیں ۔ متوسط درجے کے والدین بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے جذبے میں جنون کی حد تک پہنچ جاتے ہیں ۔ کتاب زدہ اور بے چین قسم کے بچے اکثر اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اونچے طبقے کے بچے عیش و عشرت کے ماحول کی وجہ سے محنت سے جی چرانے لگتے ہیں، جس سے تعلم پر منفی اثر پڑتا ہے ۔

12 ۔ تمدن :

تمدنی عناصر بھی بچوں کے تعلم پر اثرانداز ہوتے ہیں ۔ تمدنی اقدار و معیار ہر خطے اور ہر ملک میں مختلف ہوتے ہیں ۔ مثلاً صنعتی تمدن ، میکانکی اور صنعتی اقدار کو فروغ دیتا ہے ایسے تمدن میں بچوں کو سائنس ، انجینئرنگ اور مشینی کاموں میں کمال پیدا کرنے کی رغبت ہوتی ہے ۔ جمہوری تمدن میں بچے مساوات ، عدل ، خودمختاری اور آزادئ فکر و عمل کی قدروں سے روشناس ہوتے ہیں ۔

13 ۔ کھیل اور عملی کام :

تعلیم کے جدید تصور میں تعلم کی کامیابی کے لیے کھیل کود اور عملی کام کاج کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے ۔ تفریحی پروگرام اور دیگر ہم نصابی سرگرمیوں کو تعلم میں معاون سمجھنے کا رجحان عام ہے ۔ امام غزالی نے بہت پہلے کھیل کود کی تعلیمی افادیت کی نشاندہی کی تھی اور بتایا تھا کہ اس سے متعلم میں تازگی پیدا ہوتی ہے اور وہ از سر نو تعلم کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے ۔

تحریک اور تعلم

تحریک سے مراد کسی فرد کی ایسی داخلی کیفیت ہے جو اس کے اندر ایک مخصوص رجحان اور لگن پیدا کرتی ہے اور یہ مقصد کی تکمیل تک جاری رہتی ہے ۔ تحریک تعلم کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے ۔ مثلاً ایک طالب علم میں اگلی جماعت میں جانے کی لگن اسے امتحان میں کامیابی کے حصول پر اکساتی ہے جماعت میں اول دوم اور سوم آنے پر انعام کی خواہش بھی تعلم میں تحریک پیدا کر سکتی ہے ۔ دوسرے لفظوں میں تعلم کا عمل مکمل طور پر محرکات کا مرہون منت ہے ۔ محرکات کا یہ نظام خاصا پیچ دار ہے ۔ مثلاً ایک طالب علم انگریزی کے مضمون کا کام سزا سے بچنے کے لیے کر کے لاتا ہے ۔ جبکہ دوسرا استاد کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لاتا ہے جب کہ ایک اور طالب علم ڈر کی وجہ سے اور بھی باغی ہو جاتا ہے ۔ تعلم اور تحریک کے باہمی تعلق کی اہمیت کے پیش نظر اس سلسلے میں استاد کو ہمیشہ چوکس رہنے کی ضرورت ہے بصورت دیگر اس امر کا بھی اندیشہ ہے کہ اس کا طرز عمل تعلم کے لیے منفی تحریک کا باعث بن جائے ۔

تحریک اور ضروریات

تحریک سے افراد میں مثبت کردار پیدا ہوتا ہے یا پہلے سے موجود کردار میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے ۔ اس کردار کی بنیاد انسانی ضرورت ہوتی ہے اس لیے کوئی محرک اس وقت تک تحریک پیدا نہیں کر سکتا جب تک وہ فرد کی کسی ضرورت کو پورا نہ کرے ۔ جب کوئی ضرورت شدت کے ساتھ سامنے آتی ہے تو وہ فرد میں اضطراب کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور یہ اضطرابی کیفیت اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک فرد اپنی ضرورت پوری نہیں کر لیتا اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اسے متحرک ہونا پڑتا ہے ۔ اس طرح ضروریات تحریک کا اور تحریک تعلم کا باعث بنتی ہے ۔

محرکات اور ان کی اقسام

تحریک اور تعلم کے باہمی تعلق کی اہمیت کے پیش نظر ذیل میں اہم محرکات کی نشاندہی کی گئی ہے :

1 ۔ فعلیاتی محرکات :

فعلیاتی محرکات سے مراد وہ محرکات ہیں جو فرد کے فطری تقاضوں پر مبنی ہوتی ہیں ۔ ان میں کھانا اور پینا ، ہوا اور گرمی سردی سے بچاؤ ، خطرات سے حفاظت ، آرام و سکون اور جنسی خواہش وغیرہ شامل ہیں ۔ یہ ضروریات پوری کرنے کے لیے ہم جو راستے اختیار کرتے ہیں وہ ہمیں معاشرے سے ملتے ہیں ۔ تعلیم کے نتیجے میں ہم ان میں ترمیم بھی کرتے رہتے ہیں اس طرح کے ترمیم شدہ محرکات کو اکتسابی محرکات کہا جاتا ہے ۔

2 ۔ نفسیاتی محرکات :

تعلم میں نفسیاتی محرکات بڑی نمایاں اہمیت رکھتے ہیں ۔ یہ محرکات فعلیاتی محرکات کی طرح طبعی نہیں بلکہ اکتسابی ہوتے ہیں ۔ ان میں ذاتی وقار ، خودنمائی ، دوسروں کی نظر میں مقبولیت ، شخصی آزادی ، اختیار کے حصول کی خواہش اور دوسروں کی محبت حاصل کرنے کی خواہش شامل ہے ۔

3 ۔ ترغیبات :

ترغیبات کے لیے تعلیمی دنیا میں جزا اور سزا کے محرکات اکثر استعمال ہوتے ہیں ۔ ان محرکات کے کچھ فوائد اور کچھ نقصان ہیں مثلاً سزا کی وجہ سے بچوں میں جھوٹ ، ڈھٹائی اور اس طرح کی دوسری غلط صفات پیدا ہو جاتی ہیں جب کہ انعام سے لالچ کو فروغ ملتا ہے ۔ یہ محرکات جب تک موثر ہوں بچے میں تحریک پیدا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے معطل ہونے کی صورت میں بچوں میں سستی پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے ۔ لہٰذا ان محرکات کا استعمال احتیاط سے کرنا چاہیے ۔

حافظہ اور فراموشی

گزرے ہوئے زمانے کے واقعات اور تجربات کو دوبارہ ذہن میں اس طرح لانا کہ اس کی مقدار اور معیار میں زیادہ فرق نہ پڑے حافظہ کہلاتا ہے ۔ اچھا حافظہ انسان کی ایک اعلیٰ خوبی ہے ۔ اس کی وجہ سے انسان قابل احترام سمجھا جاتا ہے ۔ تعلم کی پختگی میں اچھے حافظے کا بڑا دخل ہے ۔

حافظے کے اجزا :

حافظہ مختلف قسم کے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ یہ ایک ایسی ذہنی کیفیت ہے جو چار اجزا پر مشتمل ہے ۔ ان اجزا پر ذیل میں بحث کی گئی ہے ۔

1 ۔ یاد داشت

مہیج اور ردعمل کے تعلق کا نام یادداشت ہے ۔ یاد داشت مختصر وقفے یا طویل وقفے کی ہو سکتی ہے اعادہ حافظہ یاد داشت کی خاص قسم ہے جس سے کسی چیز کو بار بار تکرار سے یاد کر لیا جاتا ہے ۔ حقیقی یاد داشت وہ ہے جس میں یاد کیے جانے والے نفس مضمون کا تعلق اس کے مفہوم سے قائم کر لیا جاتا ہے ۔

2 ۔ بازیافت :

گزرے ہوئے واقعات کی یاد بازیافت کہلاتی ہے ۔ اس کے اسباب درج ذیل ہیں :۔

(i) اصول تکرار : تکرار سے مہیج اور ردعمل کا تعلق پختہ ہو تو بازیافت میں آسانی ہو جاتی ہے ۔

(ii) اصول تاخیر : اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز تازہ دیکھی ہو وہ جلد یاد آ جاتی ہے اور جسے دیکھے ہوئے عرصہ گزر گیا ہو اس کی بازیافت میں دقت ہوتی ہے ۔

(iii) اصول اولیت : کسی میدان میں پہلا واقعہ زندگی بھر یاد رہتا ہے ۔ لہٰذا کسی خاص موقع پر پیش آنے والے پہلے واقعات کی بازیافت آسان ہوتی ہے مثلاً سکول ، کالج یا ملازمت کا پہلا دن ۔

(vi) اصول شدت : کسی واقعہ کو جتنی دلچسپی سے سنا جائے گا اسے ذہن اتنا ہی جلد قبول کر لے گا ۔ دلچسپی کی وجہ سے واقعہ بھی بار بار سننے کو جی چاہے گا ۔ ایسے واقعات میں شدت پیدا ہو جاتی ہے اور بوقت ضرورت انھیں آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہے ۔

(vii) مقام میں یکسانیت : مقام کے بدلنے سے دیکھے ہوئے واقعہ یا سنے ہوئے سبق کو ذہن میں لانے میں دقت محسوس ہوتی ہے جب کہ مقام کی یکسانیت سے بازیافت آسان ہوتی ہے ۔

(viii) جذباتی اور ذہنی کیفیت : بازیافت پر فرد کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا بہت اثر ہوتا ہے ۔ ذہنی عادت یا شدید جذباتی حالت سے بازیافت میں آسانی ہوتی ہے ۔

3 ۔ شناخت :

یہ حافظے کا تیسرا جز ہے ۔ بازیافت میں یاد کیے ہوئے واقعات یا تجربات کا سامنے ہونا ضروری نہیں لیکن شناخت میں گزری ہوئی اصل چیز سامنے لائی جاتی ہے ۔ پختہ تعلم کی ذاتی صلاحیت اور مماثلت جیسے عوامل شناخت پر اثرانداز ہوتے ہیں ۔

4 ۔ فراموشی :

فراموشی گزرے ہوئے واقعات یا پڑھے ہوئے اسباق کے بھولنے کا نام ہے ۔ ماہرین نفسیات کے خیال کے مطابق یاد کرنے کے لیے بھولنا ضروری ہے ۔ بھولی ہوئی چیز یاد آ جانے کو احیا کہتے ہیں ۔

احیا حافظے کی دلچسپ صلاحیت ہے جس کی وجہ سے بھولے ہوئے واقعات پھر سے یاد آ جاتے ہیں ۔

فراموشی کے اسباب اور ان کے ازالے کی تدابیر

1 ۔ مشق سے فراموشی کی رفتار کم ہوتی ہے ۔

2 ۔ ابتدائی تعلم جامع ہو تو فراموشی کم ہوتی ہے ۔

3 ۔ عملی زندگی میں کام آنے والے تجربات کے تعلم سے فراموشی کی مقدار میں کمی واقع ہوتی ہے ۔

4 ۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فراموشی کی مقدار بڑھتی جاتی ہے ۔

5 ۔ تعلم کی بعض اقسام زیادہ بھولتی ہیں جب کہ بعض میں فراموشی کم ہوتی ہے ۔

6 ۔ تعلم کے عدم استعمال سے فراموشی بڑھ جاتی ہے ۔

7 ۔ یاد کرنے کے بعد سو جانے سے فراموشی کم ہوتی ہے جب کہ یاد کر کے دوسرے واقعات میں مصروف ہو جانے سے فراموشی بڑھتی ہے ۔

8 ۔ جسمانی اور نفسیاتی صحت مندی سے فراموشی کم اور بیماریوں کی موجودگی میں فراموشی کی رفتار بڑھ جاتی ہے ۔

9 ۔ ملتے جلتے نفس مضمون کو ایک ساتھ یا آگے پیچھے یاد کرایا جائے تو اس سے فراموشی کی رفتار بڑھتی ہے ۔

10 ۔ بھوک ، پیاس اور تکان کے عالم میں حاصل شدہ تعلم کی فراموشی کا امکان بڑھ جاتا ہے ۔

انتقالِ تعلم

پہلے سیکھے ہوئے کسی رویے ، مہارت یا علم کا کہیں دوسری مہارتوں رویوں اور تصورات سیکھنے پر جو اثر پڑتا ہے ، اسے "انتقال تعلم" کہا جاتا ہے ۔ اس صلاحیت کے مطابق اگر طلبہ کو نمائندہ قسم کے تصورات ، مہارتوں اور رویے سکھا دیے جائیں تو وہ اپنی آئندہ زندگی میں انھیں حسب موقع ترمیم و اضافے کے ساتھ استعمال کرنے کے قابل ہوں گے ۔ اگر ایک فعالیت کا تعلم دوسری فعالیت کے سیکھنے میں سہولت پیدا کرے تو اسے مثبت انتقال تعلم کہتے ہیں اور جب پہلے سے سیکھی ہوئی فعالیت بعد میں سیکھی جانے والی فعالیت میں رکاوٹ پیدا کرے تو تعلم کا یہ انتقال منفی ہو گا ۔ جب ایک فعالیت کا تعلم دوسری فعالیت سیکھنے پر کوئی اثر نہ ڈالے تو اسے صفر انتقال تعلم یا تعدیل (Neutral) انتقال کہتے ہیں ۔

انتقالِ تعلم کے نظریات

1 ۔ ذہنی انضباط کا نظریہ :

اس نظریۂ تعلم میں ذہنی تربیت پر زور دیا جاتا ہے اور اس کا مقصد ذہنی صلاحیت کو بڑھانا ہے ۔ اس نظریے کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ انسانی ذہن مختلف اہلیتوں مثلاً حافظے ، غور و فکر ، قوت فیصلہ وغیرہ کا مجموعہ ہے ۔ لہٰذا طلبہ کو ایسے مضامین پڑھائے جائیں جو ان کی ذہنی صلاحیتوں کی تربیت کریں ۔ چنانچہ ابتدائی دور میں ریاضی ، فلسفہ اور تاریخ کو شامل نصاب کیا جاتا رہا ۔ اس نظریے میں ذہنی ورزش کی افادیت کا تصور پایا جاتا تھا ۔

2 ۔ مماثل عناصر کا نظریہ :

اس نظریے کی رو سے تعلم مماثل عناصر کی مدد سے منتقل ہوتا ہے ۔ اس کے مطابق ذہن ایک مکمل یونٹ کے طور پر کام کرتا ہے ۔ تھارن ڈائیک کے مطابق ایک سیکھی ہوئی فعالیت کا دوسری فعالیت سیکھنے پر اس لیے اثر پڑتا ہے کہ ان دونوں میں کچھ اجزا مشترک ہوتے ہیں ۔ اگر تعلم کی دونوں صورتوں میں مواد ، رویے ، مقاصد اور طریقۂ کار ملتا جلتا ہو گا تو انتقالِ تعلم موجود ہو گا ۔

3 ۔ نظریۂ تعمیم :

اس نظریے کے مطابق انتقالِ کا لفظ تعمیم ہی کا ہم معنی ہے ۔ اس نظریے میں سوجھ بوجھ حاصل کرنے کی اہلیت پر زور دیا گیا ہے ۔ یعنی فرد صورت حال کا مکمل جائزہ لینے کے بعد اس کی تعمیم کے اصول اخذ کرتا ہے اور پھر دوسری صورت حال میں ان اصولوں کا اطلاق کرتا ہے ۔ اس کا نام انتقالِ تربیت ہے ۔ اس نظریے کے مطابق ایک موقع پر سیکھے ہوئے حقائق ، طریقہ ہائے کار یا رویے انتقالِ میں اس وقت تک کوئی حقیقت نہیں رکھتے جب تک عملی استعمال کے لیے دوسرے موقع کے ساتھ ان کا تعلق جوڑ نہیں لیا جاتا ۔ گویا اس نظریے میں مرکزی تصورات اور اصولوں کے سمجھنے پر زور دیا جاتا ہے ۔

4 ۔ گیسٹالٹ کا نظریہ :
نظریہ تعمیم کئی ترمیموں کے بعد گیسٹالٹ کے نظریے کی صورت میں سامنے آیا ۔ اس نظریے کے مطابق کُل اور جُز کا باہمی تعلق ہی تربیت کا سبب ہے ۔ اگر سیکھنے والا اس تعلق کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے تو انتقال آسان ہو جاتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں انتقالِ تعلم ، سیکھنے والے کی بصیرت اور مواقع کی مشابہت کا فطری نتیجہ ہے ۔ اس سے واضح ہوا کہ اس مکتب کے ماہرین کے مطابق ایک بامعنی کُل کا تعلم اس کے اجزا کی ترتیب نو کی مدد سے تعلم میں تبدیلی پیدا کرتا ہے ۔ تعلم کی ایک خاص صورت حال میں حصہ لینے کی وجہ سے ایک مجموعی رد عمل حاصل ہوتا ہے جو کلی یا جزوی طور پر ایسی دوسری صورت حال میں دہرایا جا سکتا ہے ۔

مؤثر تعلم کے اصول

موثر تعلم کے لیے درج ذیل اصولوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے :

(الف) اصولِ تاثیر:
یہ اصول اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ تعلم کا عمل کامیاب ہو تو متعلم کو اس سے فرحت اور دلچسپی محسوس ہوتی ہے اور مثبت تاثیر کی وجہ سے تعلم دیرپا اور کامیاب رہتا ہے اس کے برعکس تعلم میں ناکامی سے بوریت پیدا ہوتی ہے اور تعلم کا عمل ناکام اور غیر مستقل رہتا ہے ۔ قانونِ تاثیر کے مطابق کردار کے پیدا ہونے یا موجود کردار کے پختہ ہونے کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ عمل کا نتیجہ اطمینان بخش صورتِ حال میں برآمد ہو ۔

(ب) اصول مشق:
یہ اصول اس حقیقت کو اہمیت دیتا ہے کہ مشق اور تکرار ، سیکھنے کے عمل کے لیے سازگار ہوتے ہیں ۔ اس کے برعکس سیکھے ہوئے مواد کی مشق نہ کی جائے تو تعلم کے عمل پر ناسازگار اثر پڑتا ہے ۔

(ج) اصول آمادگی :

اس اصول کے مطابق جب متعلم سیکھنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر آمادہ ہو تو تعلم موثر ثابت ہوتا ہے ۔ اس کے برعکس اگر متعلم میں سیکھنے کے لیے رغبت اور آمادگی موجود نہ ہو تو تعلم بے اثر ثابت ہوتا ہے ۔

(د) اصول تلازم :

اس کے مطابق مواد تعلم متعلم کی زندگی سے ربط رکھتا ہو تو تعلم آسان ہو جاتا ہے ۔ لہٰذا اساتذہ کو چاہیے کہ طلبہ کے تجربات اور مشاہدات کے حوالے سے تعلم کا اہتمام کریں ۔

ذہنی صحت اور تعلم

تعلم کا انحصار بڑی حد تک بچّوں کی ذہنی صحت پر ہوتا ہے ۔ کوئی بچّہ جس حد تک ذہنی طور پر صحّت مند ہو گا اس حد تک اس کے تعلم کی اثر پذیری زیادہ ہو گی ۔ اس کے برعکس ذہنی طور پر غیر صحّت مند بچّے پر تعلم کا عمل غیر موثر ثابت ہوتا ہے ۔

تعلم میں ذہنی صحت کے نظریے کا چرچا آج کل بڑا عام ہو گیا ہے ۔ اس کے مطابق مدرسے میں زیر تعلیم بچّوں کی ذہنی صحّت کا خیال رکھنا تعلیمی عمل کے لیے ضروری ہے ۔ مینٹل ہیلتھ پروگرام کے تحت مدرسے میں ذہنی صحت کے کلینک کا قیام ضروری ہے تاکہ بچّوں کو ذہنی صحّت کے مسائل کے حل میں فوری مدد دی جا سکے ۔

ایک ہی کمرۂ جماعت میں ذہنی صحّت کے اعتبار سے مختلف قسم کے بچّے ہوتے ہیں جن میں اکثریت متوسط درجے کے بچّوں کی ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ کچھ اوسط سے کم اور کچھ اوسط سے بہتر ہوتے ہیں جب کہ کچھ استثنائی بچّے بھی ہو سکتے ہیں ۔ کچھ بچّے ذہنی اور جسمانی طور پر معذور ہو سکتے ہیں اور کچھ ذہنی طور پر فطین و ذہین ہو سکتے ہیں ۔ اس صورت حال میں تعلم کی کامیابی کے لیے اگر استاد ذہنی صحّت کے بنیادی اصولوں پر دسترس حاصل کر لے تو وہ اپنی تدریس کو موثر بنا سکتا ہے ۔ ذہنی صحّت کے رہنما اصول اگلے صفحے پر درج ہیں ۔

1 ۔ بچّے کو شروع عمر ہی سے محبت کا رویہ بہم پہنچایا جائے تاکہ اس بنیاد پر دوسروں کے متعلق اعتماد کا رجحان نشوونما پا سکے اور اس میں ذہنی تحفظ کا احساس پیدا ہو ۔

2 ۔ بچّے کی شخصی قدر و قیمت کا اعتراف کیا جائے اور اس کے ساتھ اپنائیت کے احساس کو مستحکم کیا جائے ۔

3 ۔ بچّے میں عزت نفس کے ساتھ ساتھ دوسروں کے حقوق کا احترام پیدا کیا جائے تاکہ وہ عملی زندگی میں باہمی تعاون کا رویہ اختیار کر سکے ۔

4 ۔ بچّے کو ایسے مواقع مہیا کیے جائیں جن میں اس کی تخلیقی صلاحیتوں اور اس کے تخیل کا اظہار ہو سکے ۔

5 ۔ بچّے میں تجسس اور محنت کا مادہ پیدا کیا جائے تاکہ وہ کامرانی سے حاصل ہونے والی تسکین کا شعور حاصل کر سکے ۔

6 ۔ بچّے کے لیے صحّت مندانہ کھیل کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ اس کے تعلم میں معاشرتی تجربات اور مسرت و راحت کے جذبات کا اضافہ ہو ۔

مشقی سوالات

1۔ تعلیم اور نفسیات کا آپس میں کیا تعلق ہے ۔ مثالیں دے کر واضح کیجیے ۔

2۔ ماہرین نفسیات کے نزدیک نشوونما کے مدارج کیا ہیں ؟ طفولیت کی نفسیاتی خصوصیات بیان کیجیے ۔

3۔ لڑکپن کے دور کی نفسیاتی خصوصیات کا جائزہ لیجیے ۔

4۔ نشوونما کے مدارج میں نو بلوغت کا دور نہایت ہیجان آمیز ہوتا ہے ۔ کیوں ؟ اس دور کے طلبا کے لیے اساتذہ کو کن تعلیمی تقاضوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے ۔

5۔ نشو و نما کے مدارج میں بلوغت کا دور ایک ٹھہراؤ کا دور ہوتا ہے ۔ اس دور کی جسمانی اور معاشرتی خصوصیات کیا ہیں ؟

6۔ تعلیم کی کامیابی کے لیے محرکات کی کیا اہمیت ہے ۔ محرکات کی مختلف اقسام کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر روشنی ڈالیے ۔

7۔ حافظے اور اس کے اجزا پر مفصل نوٹ لکھیے ۔

8۔ فراموشی کے اسباب اور ان کے ازالے کی تدبیر بیان کیجیے ۔

9۔ انتقالِ تعلم سے کیا مراد ہے ؟ انتقالِ تعلم کو متاثر کرنے والے عوامل پر ایک نوٹ لکھیے ۔

10۔ انتقال تعلم کے نظریات پر مختصر بحث کیجیے ۔

11۔ مؤثر تعلم کے اصولوں پر روشنی ڈالیے ۔

12۔ ذہنی صحّت اور تعلم کے باہمی تعلق پر بحث کیجیے ۔

13۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیجیے ۔

(الف) اجتماعی تعلیمی عمل میں کمرۂ جماعت میں استاد کے لیے جو تدریسی مسائل پیدا ہوتے ہیں ان میں سے پانچ کے نام لکھیے ۔

(ب) لڑکپن میں معاشرتی نشوونما کے پہلو سے ایک ماہر نفسیات کے نزدیک نفسیاتی

اعتبار سے بچوں کے تعلم میں کون سے آٹھ عوامل پیش نظر رہنے چاہئیں۔

(ج) دور بلوغت کی جذباتی نشوونما کے بارے میں پانچ نکات درج کریں۔

(د) تحریک اور تعلم میں آپس کے تعلق کو پانچ جملوں میں بیان کریں۔

(ہ) محرکات کی پانچ اقسام کی نشاندہی کیجیے۔

(و) گسٹالٹ کے نظریۂ تعلم پر مختصر نوٹ لکھیے۔

14۔ درج ذیل بیانات میں سے جو صحیح ہیں ان کے سامنے ص اور جو غلط ہیں ان کے سامنے غ کے گرد دائرہ لگائیے۔

i۔ طفولیت میں بچہ زیادہ تر تخیل اور حواس خمسہ پر انحصار کرتا ہے۔ ص غ

ii۔ لڑکپن کے دور میں بچہ مشاہدات سے نتائج اخذ کرتا ہے اور ان نتائج کا روزمرہ زندگی پر اطلاق کرتا ہے۔ ص غ

iii۔ تعلم کردار کی وہ تبدیلی ہے جو تجربے کے نتیجے میں حاصل ہو۔ ص غ

iv۔ تحریک کو تعلم میں بنیادی حیثیت حاصل نہیں۔ ص غ

v۔ فعلیاتی محرکات سے مراد وہ محرکات ہیں جو فرد کے اکتساب پر مبنی ہوتے ہیں۔ ص غ

15۔ صحیح ترین جواب پر (✓) کا نشان لگائیے۔

i۔ کس دور میں اوسط لڑکے لڑکیوں کی نسبت قدرے لمبے اور بھاری نظر آتے ہیں

(الف) طفولیت (ب) نوبلوغت (ج) لڑکپن

ii۔ کس دور میں قد کی نشو و نما بڑی نمائندہ حیثیت رکھتی ہے۔

(الف) نو بلوغت (ب) طفولیت (ج) لڑکپن

iii۔ کس دور میں بچہ ذخیرۂ الفاظ کے اضافے اور ان کی بار بار تکرار سے لطف اندوز ہوتا ہے

(الف) لڑکپن (ب) بلوغت (ج) طفولیت

iv ۔ تحریک سے کسی فرد کی کون سی کیفیت مراد ہے ۔

(الف) داخلی (ب) ذہنی (ج) خارجی

16 ۔ درج ذیل میں خالی جگہ کو پر کیجیے ۔

i ۔ نشوونما سے مراد بچّے کی تمام جسمانی ، ذہنی ، معاشرتی اور جذباتی تبدیلیوں کا --------- ہے ۔

ii ۔ طفولیت کا دور --------- سے لے کر تقریباً --------- سے --------- تک جاری رہتا ہے ۔

iii ۔ چھٹے سال تک پہنچتے پہنچتے بچّے کا ذخیرہ الفاظ ------------ ہو جاتا ہے ۔

iv ۔ ماہرین نفسیات کے نزدیک بچّے کی عمر کا -------- سال جذباتی زندگی کے لیے بڑا اہم ہوتا ہے ۔

v ۔ لڑکپن کے دور میں معاشرتی نشوونما کے لحاظ سے بچّے ---------- کی طرف مائل ہوتے ہیں ۔

چھٹا باب

تعلیمی فکر میں مسلمانوں کا حصّہ

علم و فن کی ترقی میں مسلمانوں کی خدمات تاریخ تہذیب میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ شاید ہی کوئی شعبۂ علم و فن ایسا ہو جس میں مسلمانوں کی تحقیقی اور اجتہادی کوششوں نے حسن کمال کا مظاہرہ نہ کیا ہو ۔ علم فلسفہ اور تعلیمات کا میدان بھی مسلمان اہل فکر و فن کی کاوشوں کی جولانگاہ رہا ہے ۔ اس میدان میں ان کی خدمات تعلیمات کے طلبہ ہی کے لیے نہیں بلکہ کارکن معلمین ، منتظمین اور تعلیمی منصوبہ سازوں کے لیے بھی راہنمائی کا قابل قدر سرچشمہ ثابت ہو سکتی ہیں ۔

مسلمانوں میں صاحب فضل و کمال افراد کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کی فہرست سازی کے لیے بھی ایک ضخیم ڈائریکٹری کی ضرورت ہوگی ۔ ذیل میں نمونے کے طور سے محض تین اہل فضل مسلمانوں کے تعلیمی تصورات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے ۔ ان میں سے تاریخی ترتیب کے اعتبار سے اولین نام ابن سینا کا ہے جس نے دسویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی کے دوران دینی علوم ، ریاضی ، طب اور فلسفیانہ علوم کے علاوہ شعر و ادب کے میدان میں بھی قائدانہ مقام حاصل کیے رکھا اور آج تک اہل فکر اور ماہرینِ فن ان کی اس عظمت کو تسلیم کرتے ہیں ۔ دوسرے ماہر فن قاضی ابن جماعہ ہیں ۔ ان کی ماہرانہ تعلیمی فکر تقریباً پچاس برس کے عملی تجربات پر مشتمل ہے ۔ ان کی شاہکار تصنیف تذکرۃ السامع ، کو تعلیمی انتظامات کی نصابیات میں شامل کیا جا سکتا ہے ۔ پیشہ ورانہ روابط اس کتاب کا خاص موضوع ہے ۔ اس جائزے میں شامل تیسرا نام زرنوجی کا ہے ۔ تاریخی ترتیب کے اعتبار سے وہ ابن جماعہ پر مقدم ہیں ۔ ان کے تعلیمی تصورات میں حکمت تدریس کو خصوصی ہدف کی حیثیت حاصل ہے اور اس معاملے میں ان کی کتاب ، تعلیم المتعلم ، کو آج بھی ایک بلند پایہ وسیلی ماٰخذ قرار دیا جا سکتا ہے ۔

ابنِ سینا

الشیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبداللہ بن حسن بن علی بن سینا صفر 370ھ مطابق اگست 980ء میں بخارا کے ایک نواحی قصبے افشیہ میں پیدا ہوئے ۔ ان کی ابتدائی تعلیم بخارا ہی میں ہوئی ۔ دس سال کی عمر میں انھوں نے قرآن حفظ کر لیا تھا اور علوم دینیہ اور علم نجوم کے اہم حصے پر دسترس حاصل کر لی تھی ۔ ابتدائی عمر ہی میں انھوں نے ہندوستان کے حساب اور الجبرا کی تعلیم حاصل کر لی ۔ اس علم میں ان کے استاد محمود مساح بقال تھے ۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اسماعیل زاہد سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور پھر ابو عبداللہ الناتلی سے منطق کا درس لیا ۔ بہت جلد انھوں نے منطق ، طبعیات اور ریاضی میں مہارت حاصل کر لی اور پھر مابعد الطبعیات کا مطالعہ شروع کیا جو انھیں خاصا مشکل معلوم ہوا اور آخر فارابی کی ایک کتاب کے مطالعے سے اس علم کی مشکلات حل ہوئیں اور مابعد الطبعیات کے بھی فاضل ہو گئے ۔ طب میں تو انھیں ایسا کمال حاصل ہوا کہ سولہ سترہ برس کی عمر میں ہی شہرہ آفاق ہو گئے ۔ اس فن میں ان کی کتاب "القانون" آج تک بے مثال سمجھی جاتی ہے ۔ جسے طب کے میدان میں حرف آخر کی حیثیت حاصل ہے ۔ اکثر علوم و فنون میں انھوں نے بیس برس کی عمر تک مہارت حاصل کر لی تھی ۔ البتہ شعر و ادب میں انھیں بس واجبی سی دسترس حاصل تھی ۔ لیکن ادھیڑ عمر میں کسی کے طعن کی وجہ سے اس طرف متوجہ ہوئے اور چند برس میں وہ کمال حاصل کیا کہ اس میدان کے بھی ممتاز شہسوار ہو گئے ۔ اکیس برس کے تھے کہ مصنف کی حیثیت سے نامور ہو گئے اور پھر روز بروز ان کے علمی کارنامے اور مرتبہ و مقام بلند سے بلند تر ہوتا گیا ۔ یہ ان کا خاص کمال تھا کہ پریشان کن سیاسی مشاغل کے باوجود ساری عمر تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں مشغول رہے ۔ اپنی دیگر مصروفیات کی وجہ سے انھوں نے درس و تدریس کے لیے رات کا ایک حصہ مختص کیا ہوا تھا ۔

ابنِ سینا بنیادی طور سے ایک مذہبی مفکر تھے ۔ چنانچہ ان کی بعض کتب خالص مذہبی موضوعات پر تھیں ۔ تاہم ان کی کثیر تصانیف میں فلسفہ ، منطق ، ریاضی ، تصوف ، طب ، طبعیات اور فلکیات سے لے کر مابعد الطبعیات تک تمام علمی میدان شامل ہیں ۔ عام طور سے

انھیں ارسطاطالیسی مفکر سمجھا جاتا ہے لیکن دراصل وہ ایک مجتہد فلسفی تھے اور ان کا اپنا جداگانہ نظام فکر تھا جس میں یونانی فلسفے کا تنقیدی جائزہ بھی شامل تھا اور اسلامی تعلیمات بالخصوص تصوف کی عقلی توجیہہ بھی شامل تھی ۔ ان کی تصنیف "کتاب الشفا" ایک جامع العلوم انسائیکلوپیڈیا ہے اور ان کی علمی جامعیت کی مظہر ہے ۔ ان کی متعدد تصانیف مختلف یورپی زبانوں میں بار بار چھپ چکی ہیں ۔

بنیادی فلسفیانہ تصورات

ابن سینا بنیادی طور سے ایک مذہبی مفکر تھے لیکن ان کا اسلوب سراسر عقلیاتی تھا ۔ چنانچہ وہ فنِ منطق کو بڑی اہمیت دیتے ھیں ۔ وہ منطقی استدلال کو صحیح علم کا ذریعہ قرار دیتے ہیں ۔ ان کی رائے ہے کہ منطق سے ایسا معیاری اصول ہاتھ آ جاتا ہے کہ انسان خطا سے محفوظ ہو جاتا ہے ۔ ان کا تصور تھا کہ علم کا سرچشمہ عقل موثر (Agent Intellect) ہے ۔ اس عقل موثر کے ساتھ ہم آہنگی کے نتیجے میں علم حاصل ہوتا ہے ۔ انسان میں ہم آہنگی کا میلان اور اس کے لئے فطری صلاحیت موجود ہو تو عقل موثر اس کی روح کو قابل فہم شکل میں القا کرتی ہے ۔

وجودیاتی تصورات کے ضمن میں ابنِ سینا کے تصورات معروف تصورات سے کسی قدر مختلف ہیں۔ مثلاً وہ خدا کی ذات کو واجب الوجود قرار دیتا ہے اور کائنات کو مخلوق مانتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی آسمانوں کو ازلی اور نقص سے پاک قرار دیتا ہے ۔ معروف اسلامی تصور کے مطابق ازلی ابدی ذات خدا کی ہے اور باقی سب کائنات اللہ کی آزاد مرضی کا کرشمہ ہے ۔

انسانی فطرت کے متعلق بھی ابن سینا نے واضح تصورات پیش کیے ہیں ۔ انھوں نے نفس انسانی کو درج ذیل چار خواص یا قوتوں سے مسلح قرار دیا ہے :

1 ۔ خواص ظاہری یا حواسِ خمسہ

2 ۔ خواصِ باطنی

3 ۔ خواص معرکہ

4 ۔ خواص عاقلہ

ان میں سے ہر قوت کو ابن سینا نے متعدد ذیلی اقسام میں تقسیم کیا ہے اور تمام قوتوں کا مرکز انسانی دماغ کو قرار دیا ہے ۔

قدریاتی اور اخلاقیاتی میدان میں بھی ابن سینا نے واضح تصورات پیش کیے ہیں ۔ ان کا خاص قدریاتی تصور سعادت کا حصول ہے ۔ ان کے نزدیک سعادت یہ ہے کہ انسان کا تعلق عالم عقلی سے قائم ہو جائے اور اس کی وجہ سے عالم عقلی کی طرف وہ اس قدر کھچ جائے کہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جائے ۔ ابن سینا کے نزدیک اس سعادت کے بغیر نجات ممکن نہیں ۔ سعادت کے حصول کے لیے ابن سینا فضائل و کمالات کے اکتساب کو ضروری قرار دیتے ہیں اور نفسِ انسانی کو مادے کی آلائش سے پاک کرنے پر زور دیتے ہیں ۔ اس سے بہرحال ان کا مطلب ترک دنیا نہیں ہے کیونکہ ان کے ہاں مادے کو ترک کرنے کے بجائے مادے کو مغلوب کرنے کا واضح تصور ملتا ہے ۔

اپنی ذاتی زندگی میں ابن سینا رند مشرب مشہور ہیں ۔ اس حد تک درست بھی ہے کہ وہ رواتی فلسفیوں کی طرح تارک دنیا نہیں تھے بلکہ دربار شاہی سے متعلق ہو گئے تھے تاریخ شاہد ہے کہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور اپنے باپ اور بڑے بھائی کی کوشش کے باوجود اسماعیلی نہیں ہوئے ۔ علمی کاوش کے دوران میں جہاں کہیں کوئی پیچیدگی پیش آتی تو جامع مسجد میں جاکر نماز پڑھتے اور دعا مانگتے تھے۔ حتیٰ کہ مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔ 4 رمضان 428ھ (مطابق 1037ء) میں جب ان کی وفات ہوئی تو اس سے قبل تائب ہو کر سارا مال و دولت صدقہ کر دیا ، تمام غلام آزاد کر دیے اور تلاوت کو معمول بنا لیا ۔ انھوں نے اپنے ایک صوفی دوست کو جو وصیت کی اس سے ان کے تصور اقدار کا واضح ادراک ہوتا ہے ۔ وصیت یہ تھی :

" تم کو سب سے پہلے اور سب سے آخر میں خدا کا خیال کرنا چاہیے اور اپنی آنکھوں میں اس کے دیدار کا سرمہ لگانا چاہیے ۔ اس کے سامنے پاؤں جما کر کھڑے رہنا چاہیے ۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے بہتر حرکت نماز ، سب سے بہتر سکون روزہ سب سے مفید

نیکی صدقہ اور سب سے رائگاں کوشش ریاکاری ہے ۔ بحث و مباحثہ میں مشغول رہنے سے نفس کا زنگ دور نہیں ہو سکتا ۔ بہترین عمل وہ ہے جو خلوص نیت سے کیا جائے اور بہترین نیت وہ ہے جو علم سے پیدا ہو ۔ لذتوں کا استعمال صرف اس غرض سے کرنا چاہیے کہ طبیعت کی اصلاح ہو ، آدمی کا وجود قائم رہے یا نوع کو بقا حاصل ہو ۔ اس کے ساتھ قواعد شرعیہ کی پابندی میں خلل نہ آنے دینا چاہیے اور جسمانی عبادات کا ہمیشہ پابند رہنا چاہیے ۔ "

تعلیمی تصورات

ابن سینا کے بنیادی فلسفیانہ تصورات سے ان کے تعلیمی تصورات بآسانی اخذ کیے جا سکتے ہیں ۔ ان کا تصور قدر ، اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور انسان کی عبودیت کے محور کے گرد گھومتا ہے ۔ نظامِ تعلیم میں اسی قدر کو نصب العین کی حیثیت حاصل ہو گی ۔ جس سے تصور ، کردار ، فکر و عمل کے اخلاص ، رضائے الٰہی کے حصول ، عبادات اسلامی کی پابندی اور صحت جسمانی کے قیام کو عمومی مقاصدِ تعلیم میں شامل کیا جائے گا ۔ خود علم کے فروغ کو بھی ایک مقصد تعلیم کی حیثیت حاصل ہو گی ۔

ابنِ سینا کے عملیاتی تصورات ، وجودیاتی افکار اور مذکورہ بالا مقاصد تعلیم کی روشنی میں نصاب تعلیم عقلیاتی علوم ، عقائد اسلامی ، اسلامی شعائر اور جسمانی تعلیم پر مشتمل ہو گا ۔

ابن سینا نے علوم کو تین اقسام و مدارج میں تقسیم کیا ہے :

1 ۔ اعلیٰ علوم :

اس قسم میں حکمت و دانش کا وہ عالی قدر ذخیرہ شامل ہے جس کا مادے سے کوئی تعلق نہیں ۔ فلسفہ اور اخلاقیات جیسے علوم اس زمرے میں شامل ہوں گے ۔

2 ۔ دنیوی علوم :

اس قسم میں جملہ طبعی علوم شامل ہیں نیز وہ علوم جو کسی بھی اعتبار سے طبعیات کے تابع ہیں وہ بھی اس زمرے میں شامل ہیں ۔ ان کا دائرہ کار ان اشیاء تک محدود ہے جو یا تو

ظاہری حیثیت سے مادی ہیں یا بالواسطہ مادے کے تابع ہیں ۔ مثلاً طبعیات اور علم کیمیا براہ راست اور جوہری طبعیات بالواسطہ مادے سے متعلق ہونے کی وجہ سے اس زمرے میں شامل ہونگے ۔

3 ۔ علوم وسطی:

اس قسم میں وہ علوم شامل ہیں جو بعض پہلوؤں سے مابعد الطبیعاتی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض پہلوؤں سے مادی دنیا سے متعلق ہیں ۔ اس قسم میں عام حساب اور علم ہندسہ شامل ہیں ۔ علم فلکیات بعض پہلوؤں سے ریاضیاتی علم ہے لیکن ساتھ ہی اس کا تعلق عالم طبعی سے بھی ہے لہٰذا یہ بھی علوم وسطی میں شامل ہو گا ۔ یہی حال علم موسیقی اور فنون مفیدہ کا ہے ۔

اس تقسیم علوم کی روشنی میں معیاری نصاب تعلیم وہ ہو گا جس میں ان تینوں قسم کے علوم میں توازن کا اہتمام کیا گیا ہو ۔ بہر حال منطقی طور پر اس نصاب میں اعلیٰ علوم پر مشتمل حصہ نصاب کو لازمی اور مرکزی حیثیت حاصل ہوگی ۔ دوسرے نمبر پر وسطی علوم کو رکھا جائے گا اور پھر دنیوی علوم کا نمبر آئیگا ۔

ابن سینا ایک عملی مدرس تھے ۔ فلسفہ اور طب ان کے میدان تدریس کے خاص شعبے تھے لیکن ان کی حکمت تدریس کی کوئی تفصیل دستیاب نہیں ۔ ان کے بنیادی فلسفیانہ تصورات خصوصاً تصور علم ، مقاصد تعلیم اور نصاب تعلیم کے متعلق ان کی ترجیحات سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تدریسی حکمت عملی میں عقلیاتی طریق تدریس مثلاً منطقی طریق ، حثی اور اکتشافی طریق کو بنیادی حیثیت حاصل ہو گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ طلبہ کو تزکیۂ نفس کی طرف مائل رکھا جائے گا کیونکہ محض عقلی کج بحثی سے دلوں کا زنگ دور نہیں ہو سکتا ۔

علامہ زرنوجی

علامہ برہان الدین الزرنوجی تیرھویں صدی کے ایک عرب مفکر تھے ۔ ان کی سوانح حیات کے متعلق معلومات دستیاب نہیں ۔ اس قدر معلوم ہے کہ وہ مسلک کے اعتبار سے

حنفی تھے اور حنفی فقہ کی مشہور کتاب " الہدایہ " کے مصنف امام برھان الدین علی بن ابوبکر الغرغانی المرغینانی کے فیض یافتہ تھے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب " تعلیم المتعلم " میں امام موصوف کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے ۔ ان کے ایک دوسرے استاد فخرالاسلام الحسن بن منصور الغرغانی عرف قاضی خان تھے جو فقہ حنفی کی مشہور کتاب " فتاویٰ قاضی خان " کے مصنف تھے ۔

علامہ زرنوجی کی صرف ایک کتاب دستیاب ہے اور وہ ہے " تعلیم المتعلم طریق المتعلم " یہ کتاب 1203 ء کی تصنیف ہے اور تعلیم و تعلم کے متعلق علامہ موصوف کے مشاہدات و تجربات کا مجموعہ ہے ۔ اس تصنیف کا محرک یہ امر تھا کہ علامہ زرنوجی کو تعلیم کے میدان میں طلبہ کی ناکامیوں کا شدید احساس تھا ۔ انھیں افسوس تھا کہ وہ سخت محنت کے باوجود علم کے معیار مطلوب تک نہیں پہنچتے ۔ ان کی رائے میں اس کا سبب یہ تھا کہ انھیں تعلم و اکتساب کے درست طریقوں کا علم نہیں ۔ چنانچہ اس کتاب کا بنیادی موضوع تعلم کے محرکات اور تعلم کے طریقوں پر مشتمل ہے ۔

ذیل میں ان کے تعلیمی تصورات ہی کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے :

تعلیمی تصورات

زرنوجی کے تعلیمی تصورات کی تہہ میں دراصل نفسیاتی محرکات کارفرما تھے ۔ تاہم ان کے تصورات میں مذہبی افکار کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے ۔ ان کے نزدیک علم ذہن کو جلا بخشتا ہے اور تعلیم تقویٰ کے حصول کا ذریعہ ہے ، جس کا نصب العین اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور ابدی زندگی کی فلاح حاصل کرنا ہے ۔

زرنوجی نے صرف لوازمۂ نصاب ہی کی نشاندہی نہیں کی بلکہ اس کی تنظیم میں درجہ بندی کے متعلق بھی رہنمائی بہم پہنچائی ہے ۔ ان کا تصور ہے کہ پہلے قرآن و سنت کا مطالعہ کرنا چاہیے ، پھر فقہ اور اصول فقہ کا اور اسکے بعد طب کی باری آنی چاہیے ۔ ان کے نزدیک فقہ سب سے افضل علم ہے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ قانونی علم انسان کے ملیے اسی طرح ناگزیر ہے جس طرح خوراک ضروری ہے ۔ بہرحال زرنوجی مضامین کے انتخاب کے سلسلے میں فیصلے

کا آخری حق خود طالب علم کو دیتے ہیں ۔ البتہ معلم طالب علم کے متعلق اپنی معلومات کی روشنی میں اسے ماہرانہ رہنمائی فراہم کر سکتا ہے ۔

مؤثر تدریسی حکمتِ عملی کا انحصار اچھے استاد پر ہے اور علامہ زرنوجی اس امر سے خوب آگاہ تھے ۔ چنانچہ انھوں نے طالب علم پر زور دیا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لے اور اس سلسلے میں اپنے والدین ، بزرگوں اور دوسرے باخبر لوگوں سے پوری سنجیدگی کے ساتھ مشورہ کرے ۔ جب ایک دفعہ استاد کا انتخاب ہو جائے تو نصاب کے کسی واضح حصے کی تکمیل کے بغیر حتی الامکان استاد بدلنے سے گریز کرنا چاہیے ۔ اس میں استاد کی شہرت بھی برقرار رہتی ہے اور طالب علم کا وقت بھی ضائع نہیں ہوتا ۔

استاد کے انتخاب کے بعد علامہ زرنوجی طالب علم کی رہنمائی کے موضوع کی طرف آتے ہیں ۔ اس سلسلے میں انھوں نے مطالعہ کے مؤثر طریقوں کی نشاندہی سے قبل مطالعہ کے لیے موزوں اوقات کے متعلق رہنمائی فراہم کی ہے ۔ انھوں نے زندگی کے بعض مراحل اور دن کے اوقات میں سے بعض لمحات کو تعلم کے لیے زیادہ موزوں قرار دیا ہے ۔ زرنوجی کے نزدیک زندگی میں نوبلوغت کا دور تعلیم کے لیے موزوں ترین دور ہے ۔ وہ رات کے وقت کو تعلم کے لیے سب سے زیادہ موزوں قرار دیتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح اونٹ رات کو بہتر سفر طے کرتا ہے اسی طرح انسانی ذہن رات کے لمحات میں بہتر تعلیم حاصل کرتا ہے ۔ رات کے اوقات میں سے زرنوجی شام کے دُھندلکے اور طلوعِ سحر کے وقت کو مطالعے کے لیے بہترین قرار دیتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی وہ تاکید کرتے ہیں کہ طالب علم شب بیداری کے سلسلے میں اعتدال سے کام لے تاکہ وہ کمزور نہ ہو جائے اور حصولِ علم کے معاملے میں اپنی قوت کار نہ کھو بیٹھے ۔ اس سلسلے میں انھوں نے حدیث نبویؐ کا حوالہ دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ " تمھارا ذہن تمھاری سواری کا جانور ہے اسے اعتدال کے ساتھ استعمال کرو ۔ "

طریق مطالعہ میں علامہ زرنوجی حفظ کے بجائے فہم پر زیادہ زور دیتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ طوطے کی طرح رٹنے پر صلاحیت فہم کو واضح فضیلت حاصل ہے ۔ مشہور مقولہ ہے کہ

فہم کے ساتھ دو حرف سیکھنا دو بوجھل کتابوں کے رٹنے سے بہتر ہے ۔ البتہ فہم کے بعد حفظ کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اور اس کے لیے طریقۂ تکرار کو مفید طور سے استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ اس میں ایک وقت میں دہرائے جانے والے مواد مطالعہ اور تکرار کے دوروں میں وقفوں کی کیفیت وغیرہ شامل ہیں ۔ وقفوں والے تعلم کے متعلق ان کی ایک سفارش یہ ہے کہ طالب علم کل کے سبق کو پانچ مرتبہ دہرائے ۔ اس سے ایک روز قبل کے سبق کو چار بار اور اس سے مزید ایک روز قبل والے سبق کو تین دفعہ دہرائے ۔ علیٰ ہذالقیاس ۔ بہر حال یہ سفارش ایک عام اصول کی نشاندہی کرتی ہے ۔ علامہ موصوف نے گنجائش رکھی ہے کہ ہر طالب علم اپنے سبق کی نوعیت اور اپنے حافظے کی کیفیت کے مطابق اس اصول کے اطلاق میں مناسب ترمیم کر سکتا ہے ۔

فہم و تکرار کے بعد علامہ زرنوجی کے نزدیک طالب علم کو غور و فکر کو معمول بنانا چاہیے اور متعلقہ موضوع کے متعلق وقتاً فوقتاً اپنے اساتذہ اور ساتھیوں سے تبادلہ خیالات کرنا چاہیے ۔ علامہ موصوف کی رائے میں سوالات کرنا ایک مہینے کی رٹے بازی سے بہتر ہے ۔ نیز مسائل اور پیچیدہ علمی نکات کے حل کے لیے غور و فکر ناگزیر ہے ۔ اگر طالب علم محض حقائق کے فہم پر اکتفا کر لے گا اور ان کے متعلق غور و فکر سے گریز کرے گا تو ایسا تعلم اس کے ذہن و دماغ میں جذب نہیں ہو گا ۔ تعلم کو مزید مستحکم اور بامعنی بنانے کے لیے علامہ ایک دوسرا طریقہ تجویز کرتے ہیں اور وہ یہ کہ فہم و حفظ اور غور و فکر کے ذریعے حاصل شدہ تعلم کی تحریری تلخیص کی جائے ۔ اس مقصد کے لیے وہ طالب علم کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ خالی کاغذ اور قلم دوات ہمیشہ ساتھ رکھے ۔ مؤثر تعلم کے لیے علامہ زرنوجی نے دو مزید ہدایات بیان کی ہیں ۔ ایک یہ کہ تعلیم کے معاملے میں جلد بازی سے کام نہ لیا جائے ۔ آہستہ آہستہ مگر استقامت کے ساتھ تعلم جاری رکھے اور اس اصول کو سامنے رکھے کہ "کھچڑی صرف ہلکی آنچ ہی پر سیدھی کی جا سکتی ہے" دوسری ہدایت یہ ہے کہ تعلیم میں تعطل نہ آنے دیا جائے حتیٰ کہ اس معاملے میں غربت کو بھی آڑے نہ آنے دیا جائے خواہ اس سلسلے میں محنت مزدوری کر کے ہی گزر اوقات کیوں نہ کرنی پڑے ۔

طریق تعلم سے آگے بڑھ کر علامہ زرنوجی نے محرکات تعلم پر بھی بحث کی ہے ۔ بلکہ

طریق تعلم کو انھوں نے خارجی معاونات کی حیثیت دی ہے ۔ اخلاقی تصریحات کے مقابلے میں ان خارجی معاونات کو ثانوی حیثیت حاصل ہے ۔ اخلاقی تصریحات سے بھی بڑا محرک تعلم یہ ہے کہ طالب علم واضح طور سے کسی خاص نصب العین کے حصول کی خاطر علم حاصل کر رہا ہو ۔ اعلیٰ عزائم اور امنگوں کے ساتھ اگر محنت و مشقت کی عادت شامل ہو جائے تو تعلم کمال کو پہنچ سکتا ہے ۔

ذوق و شوق اور لگن کو بھی زرنوجی نے محرکات تعلم میں شامل کیا ہے ۔ ان کی رائے ہے کہ اگر طالب علم نیم دلی سے مطالعہ کرے گا تو اس سے تعلم پر برا اثر پڑے گا ۔ تھکان اور بوریت کو بھی انھوں نے منفی عوامل میں شامل کیا ہے ۔ اس کا انھوں نے یہ علاج بتایا ہے کہ اگر ایک مضمون سے بوریت محسوس ہونے لگے تو مضمون بدل کر مطالعہ جاری رکھا جائے ۔ اس سلسلے میں انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے طریقے کا حوالہ دیا ہے کہ جب وہ دینی مسائل سے تھکن محسوس کرتے تو شعر و شاعری کی طرف رجوع فرما لیتے تھے ۔

تعلم کے ضمن میں علامہ زرنوجی نے آداب متعلم کا بھی احاطہ کیا ہے ۔ جہاں وہ متعلم کو استاد کے انتخاب میں بڑی احتیاط کی تاکید کرتے ہیں وہاں استاد کے وقار و احترام کو طالب علم پر واجب قرار دیتے ہیں ۔ اس سلسلے میں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشہور مقولے کا حوالہ دیتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھا دیا میں اس کا غلام ہوں وہ چاہے تو مجھے بیچ دے چاہے مجھے آزاد کر دے اور اگر چاہے تو غلام کی طرح مجھ سے خدمت لے لے " ۔ علامہ کے نزدیک طالب علم کے لیے مناسب نہیں کہ استاد کے سامنے سے گزرے یا استاد کی نشست پر بیٹھ جائے یا اس کی اجازت کے بغیر بات کرے ۔ استاد پر جرح و تنقید اور اس کی قابلیت آزمانے کو زرنوجی نے آداب متعلم کے خلاف قرار دیا ہے ۔ ان کی رائے تھی کہ طالب علم کا محض جذبہ عمل ہی تعلیم میں کامیابی کا ضامن نہیں ہو سکتا ۔ اس کے لیے اساتذہ اور والدین کی مدد بھی ضروری ہے ۔

علامہ زرنوجی صحبت کے اثر کے حوالے سے طالب علم کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ

اپنے ساتھی طلبہ اور دوسرے صاحب علم لوگوں ہی سے ربط ضبط رکھے ۔ اگر بے علم یا لاابالی لوگوں سے میل جول بڑھائے گا تو وہ اپنے معیار فکر کو برقرار نہیں رکھ سکے گا ۔ زرنوجی کے نزدیک علم محض کتابوں اور استادوں ہی سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ علما و فضلا سے ملنے جلنے سے ان کی محفلوں میں بیٹھ کر ان کی باتیں سننے سے اور ان سے سوالات پوچھنے سے کہیں زیادہ بہتر علم حاصل ہو سکتا ہے ۔ اگر کسی طالب علم کو ایسا موقع ہاتھ آئے تو اسے اس سے فائدہ اٹھانے میں قطعاً کوتاہی نہیں کرنی چاہیے ۔

اوپر کے جائزے کی روشنی میں علامہ زرنوجی کی تصنیف " تعلم المتعلم " کو " ہدایت نامہ متعلم " کا نام دیا جا سکتا ہے ۔ یہی مصنف کا مقصد تصنیف تھا لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ اس میں انھوں نے معلم کی حکمت تدریس کو موضوع بحث نہیں بنایا لیکن طریق تعلم اور محرکات تعلم کے باب میں انھوں نے جن اصولوں ، تدابیر اور طریقوں کی نشان دہی کی ہے ، ایک ذہین معلم ان کو سامنے رکھ کر بآسانی ایک موثر تدریسی حکمت عملی مرتب کر سکتا ہے ۔ یوں ان کی مذکورہ بالا کتاب کو اس دور کے تمام معیاروں کے مطابق " رہنمائے معلم و متعلم " کا نام دیا جا سکتا ہے ۔

ابنِ جماعہ

قاضی بدرالدین ابراہیم بن سعد اللہ بن جماعہ 639 ھ بمطابق 1241ء میں پیدا ہوئے اور 733 ھ بمطابق 1332ء میں فوت ہوئے ۔ مسلک کے اعتبار سے شافعی تھے ۔ بڑے اونچے مرتبے کے فقیہہ تھے ۔ قاضی القضاۃ تھے ۔ شیخ الاسلام تھے ۔ فقہ ، اصول فقہ ، حدیث اور تاریخ کے میدان میں ان کے شذرات مستند علمی سرمائے کی حیثیت رکھتے تھے ۔ وہ عملی معلم بھی تھے اور شاگردوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے ان سے فیض بھی حاصل کیا تھا ۔

ابن جماعہ تعلیمی فلسفی کی حیثیت سے تو نامور نہیں ہوئے لیکن معلمانہ مہارت میں ان کا مقام بہت بلند ہے ۔ اپنی مشہور آفاق کتاب " تذکرۃ السامع والمتکلم فی ادب العالم و المتعلم " میں انھوں نے فکری و نظری تصورات کی بجائے فنی و تکنیکی پہلوؤں پر بحث کی ہے ۔ ان کی یہ کتاب فن تدریس کا ایک جامع مرقع ہے ۔ ان کے تعلیمی تصورات کا ماخذ

یہی کتاب ہے ۔ چنانچہ اس کتاب سے ماخوذ تصورات تعلیم کا ایک مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے ۔

تعلیمی تصورات

ابن جماعہ نے اپنی کتاب "تذکرۃ السامع" میں جو ابواب قائم کیے ہیں ان میں صراحت کے ساتھ مقاصد تعلیم کے لیے کوئی باب مختص نہیں کیا گیا لیکن ضمناً اس میں مقاصد تعلیم کی نشاندہی ہو جاتی ہے ۔ مثلاً ایک بات واضح طور سے معلوم ہوتی ہے کہ قاضی صاحب کے نزدیک تعلیم کا نصب العین مادی نہیں اخلاقی و روحانی ہے ۔ نیز جب وہ صرف اُسی عالم کو فضیلت کا مستحق قرار دیتے ہیں جو باعمل ہو اور صرف رضائے الٰہی کو حصول علم کا مقصود سمجھتا ہو تو واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے نزدیک رضائے الٰہی اور تعمیر کردار کو مقاصد تعلیم کی حیثیت حاصل ہے ۔ قاضی صاحب نے واضح کیا ہے کہ تعلیم حاصل کرنے میں بُرے عزائم کا دخل نہیں ہونا چاہیے ۔ اسی طرح دنیوی مفادات مثلاً عزت ، عظمت ، دولت اور شہرت کے حصول کو بھی تعلیم کا مقصد نہیں بنایا جانا چاہیے ۔ اپنے اس موقف کی تائید میں قاضی صاحب نے درج ذیل حدیثیں پیش کی ہیں :

1 ۔ جو کوئی اس غرض سے علم حاصل کرتا ہے کہ وہ اس کے بل پر جہلا سے مناظرہ کرے گا یا لوگوں کو اپنے سامنے جھکائے گا یا عزت حاصل کرے گا تو اسے دوزخ میں پھینکا جائے گا ۔

2 ۔ جو کوئی اللہ کے سوا کسی اور غرض سے علم حاصل کرتا ہے یا اس کا محرک کچھ اور ہو تو اس کا مقام جہنم ہو گا ۔

گویا قاضی صاحب کے نزدیک اسلامی اصولوں کے عین مطابق تعلیم کے مقاصد رضائے الٰہی ، اخلاقی فکر و عمل ، تزکیۂ نفس ، بے غرضی اور تعمیر کردار پر مشتمل ہیں ۔ قاضی صاحب استاد کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ وہ خود اپنے طرزِ عمل سے ان مقاصد کی شہادت

دے اور اپنے طلبہ کو ان کا واضح شعور دے ۔ ان کے نزدیک استاد کا فرض ہے کہ طلبہ پر واضح کر دے کہ صرف انھی مقاصد کے حوالے سے تعلیم اللہ کی ایک نعمت ہے ۔ بصورت دیگر یہ محض بے کار ہو گی ۔ ایک مقام پر قاضی صاحب طلبہ کو نصیحت کرتے ہیں کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمھارے دلوں میں علم کے اکتساب اور اس کے معارف اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو تو انھیں بدی ، بغض ، عناد ، کفر اور ناپاک خیالات سے آزاد رکھو ۔ اسی سلسلے میں انھوں نے بڑی خوبصورت مثال دی ہے ۔ کہتے ہیں کہ علم دل کی عبادت ہے لہٰذا جس طرح ظاہری عبادت کے لیے جسم کا پاک ہونا ضروری ہے اسی طرح علمی عبادت کے لیے دل کا پاک ہونا ضروری ہے ۔ ابن جماعہ نے حسن نیت کو تعلیم کے لیے ایک لازمی شرط قرار دیا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی رضا کے حصول ، احکام الٰہی کے مطابق تعمیر اخلاق ، پابندی شریعت ، صفائی قلب کو تعلیم کا مقصد بنایا جائے ۔

ابن جماعہ کا اصل میدان حکمت تدریس ہے ۔ اس سلسلے میں ابن جماعہ نے مؤثر تدریس کے لیے استاد کی مکمل آمادگی کو ضروری قرار دیا ہے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب میں یہ واضح ہدایت درج کی ہے کہ استاد بھوک ، پیاس ، غصے ، غم یا تھکان کی صورت میں ہرگز درس نہ دے ۔ اسی طرح شدید موسم یعنی شدت کی گرمی یا سردی کی حالت میں بھی ابن جماعہ نے تدریس کی مخالفت کی ہے ۔ ان ہدایات کا محرک یہ تصور تھا کہ اس قسم کے حالات میں استاد کی کارکردگی معیاری نہیں ہو گی بلکہ اندیشہ ہے کہ اس صورت میں طلبہ کو غیر صحیح معلومات فراہم کر دی جائیں ۔

ابن جماعہ نے پرانے مسلمان علمائے کرام کے آثار سے اقتباس کرتے ہوئے خطابی طریق کے موثر استعمال میں سوالات کی اہمیت واضح کی ہے ۔ یہ سوال لیکچر کے فوراً بعد کیے جانے چاہییں اور عام سوالات کے جواب طلبہ کی مدد سے موقع ہی پر سامنے آ جانے چاہییں۔ لیکن اگر کوئی سوال تحقیق طلب مسئلے کے متعلق ہو تو اس کے جواب کے لیے ہفتے عشرے کے قریب وقت دیا جا سکتا ہے ۔ اسلامی روایت کے مطابق لیکچر کا اختتام موزوں قسم کے نصیحت آموز کلمات اور پھر دعا پر رکھنا چاہیے ۔ کلاس کے اختتام پر استاد کو فوراً کمرہ جماعت چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے ۔ اس سے ایک تو نظم و ضبط کا مسئلہ پیدا نہیں ہو گا ، دوسرے

شرمیلے قسم کے طلبہ کو استاد سے مشکل مقامات سمجھنے کا موقع مل جائے گا۔

اوصاف معلم اور اصولِ تدریس کے متعلق ابن جماعہ کے بیان کردہ درج ذیل نکات آج بھی حکمت تدریس کے سلسلے میں رہنما خطوط کا کام دے سکتے ہیں۔

1 ۔ تلاوت قرآن کو معمول بنایا جائے۔ قرآن کا جو حصّہ حفظ ہو اسے بھلانے سے بچایا جائے یعنی وقتاً فوقتاً اس کا دورہ کیا جائے تاکہ وہ یاد رہے۔ قرآن حکیم کی عارفانہ تعلیمات پر غور و فکر کرتے رہنا چاہیے۔

2 ۔ لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملا جائے۔ غریبوں سے حسنِ سلوک سے پیش آیا جائے۔ اہلِ حاجت کی مدد کی جائے اور طلبہ سے محبت کا برتاؤ کیا جائے۔

3 ۔ حسد، غرور، نفاق اور دوسروں کے متعلق حقارت جیسے بُرے اخلاق کو دل میں جگہ نہ دی جائے۔

4 ۔ اختلاف رائے، مناظرے حتیٰ کہ جھگڑے کی صورت میں بھی، انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔

5 ۔ علم کا شوق رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

6 ۔ طلبہ کے سوالات کے جواب میں تحمل سے کام لیا جائے۔ اگر کوئی سوال واضح نہ ہو تو استاد خود سوال دہرا کر اس کی وضاحت کرے۔ اگر کسی سوال کا جواب نہ آئے تو جھوٹے وقار کی بنا پر غلط جواب نہ دے بلکہ صاف اعتراف کر لے "مجھے معلوم نہیں" کیونکہ ایسا اعتراف بذات خود نصف علم ہے۔

7 ۔ تدریسی اوقات مقرر کرتے وقت طلبہ کی سہولت کا خیال رکھا جائے۔ طلوع آفتاب سے قبل اور ظہر کے بعد کے اوقات تدریس کے لیے قطعاً مناسب نہیں۔ حفظ کے لیے صبح، انشا کے لیے دوپہر اور بحث و مباحثہ کے لیے رات کا وقت موزوں ہے۔

8 ۔ استاد کو چاہیے کہ اپنے خاص مضمون میں مہارت حاصل کرے ورنہ یہ علم اور

دین کے ساتھ مذاق ہو گا ۔

9 ۔ طلبہ میں علم کی لگن پیدا کی جائے ۔

10 ۔ طلبہ کی استعداد سے بڑھ کر کوئی بات بیان نہ کی جائے ۔ ان کے حافظے پر بھی زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے ۔ محتاط قسم کی تکرار کے ذریعے اہم نکات طلبہ کے ذہن نشین کرائے جانے چاہئیں۔ درس کے مرکزی خیال کو توجہ کا مرکز بنایا جائے اور مثالوں سے اس کی وضاحت کی جائے ۔

11 ۔ محض خطابت پر انحصار نہ کیا جائے بلکہ طلبہ کے فہم کے جائزے کا بھی خیال رکھا جائے ۔ اس کے لیے بالواسطہ اور اخلاقی سوالات سے کام لینا بہتر ہے ۔ اس قسم کے سوالات کرنے سے قطعی پرہیز کیا جائے کہ " سمجھ میں آگیا ہے یا نہیں " ۔

12 ۔ ابتدائی سطح کے طلبہ کے لیے اصولِ تدریج کا خاص طور پر خیال رکھا جائے یعنی سادہ اور آسان آغاز کر کے بتدریج مشکل کی طرف اقدام کیا جائے ۔

اوصاف معلم کی طرح ابنِ جماعہ نے آداب متعلم کے متعلق بھی واضح راہنمائی فراہم کی ہے ۔ بلکہ اس سلسلے میں انھوں نے اس قدر تفصیلات بیان کی ہیں کہ ان کی باریک بینی اور وسیع النظری پر حیرت ہوتی ہے ۔ مثلاً کتاب پکڑنے ، کھولنے ، خریدنے یا ادھار لینے دینے کے آداب پر انھوں نے اپنی کتاب کے کئی صفحے صرف کیے ہیں ۔ ہوسٹلوں میں رہنے والے طلبہ کے آداب پر انھوں نے ایک مکمل باب تحریر کیا ہے ۔ اس میں سیڑھیاں چڑھنے اترنے ، برآمدوں میں چلنے ، گھومنے پھرنے اور جوتے اتارنے اور پہننے کے آداب تک شامل کیے ہیں ۔ طلبا کے متعلق ان کی چیدہ چیدہ ہدایات ذیل میں درج ہیں ۔

1 ۔ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم کے لیے وقف کر دیں ۔

2 ۔ مطالعہ کرتے وقت حفظ کا طریقہ اختیار کرنا ہو تو اس وقت ایسی جگہ نہ بیٹھیں جہاں توجہ کو ہٹانے والی کوئی بھی چیز موجود ہو خواہ وہ ہلکی پھلکی موسیقی ہی ہو ۔ البتہ مطالعے سے اکتا جائیں تو ذرا وقفہ کر لیں ، کچھ ورزش کر لیں یا ذرا ٹہل لیں ۔

3 ۔ حلقۂ درس سے غیر حاضر نہ ہوں ۔

4 ۔ حلقۂ درس میں ہم درسوں کے لیے گنجائش پیدا کریں ، ان سے تعاون کریں ۔

5 ۔ حلقۂ درس میں ادب سے بیٹھیں ۔ کوئی ہم درس بدتمیزی کرے تو اسے ملامت کریں ۔ البتہ اگر کوئی طالب علم خود معلم کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئے تو تمام طلبہ کو اس کی مذمت کرنی چاہیے ۔

6 ۔ درس کے دوران میں اگر کسی نکتے کے فہم میں دقت محسوس ہو تو اس کے اعتراف میں غرور اور حیا دونوں میں سے کسی کو بھی حائل نہ ہونے دیں ۔

اوپر کے جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ قاضی بدرالدین عرف ابن جماعہ نے تعلیم و تعلم کے میدان میں بڑی قابل قدر راہنمائی فراہم کی ہے ۔ بنیادی فلسفیانہ تصورات سے قطع نظر حکمت تدریس اور معلم و متعلم کے آداب و تعلقات کے متعلق ان کی ہدایات آج بھی رہنما اصولوں کا کام دے سکتی ہیں ۔

مشقی سوالات

1 ۔ ابن سینا کے بنیادی فلسفیانہ تصورات بیان کیجیے ۔
2 ۔ ابن جماعہ کوئی تعلیمی مفکر تو نہیں تھے البتہ ماہر تعلیم تھے ۔ بحث کیجیے ۔
3 ۔ تعلّم کے متعلق زرنوجی کے بیان کردہ اصولوں کی نشان دہی کیجیے ۔
4 ۔ ابن سینا کے تصور علم پر مختصر نوٹ لکھیے ۔
5 ۔ وجودیاتی تصورات کے متعلق ابن سینا کا فلسفہ روایتی اسلامی تصورات سے کس طرح مختلف ہے ؟
6 ۔ ابن سینا نے نفس انسانی کے کون کون سے چار خواص بیان کیے ہیں ؟
7 ۔ ابن سینا کے تصور سعادت پر مختصر نوٹ لکھیے ۔
8 ۔ ابن سینا کی وصیت کے حوالے سے ان کے تصور قدر کی وضاحت کیجیے ۔
9 ۔ ابن سینا ، ابن جماعہ اور زرنوجی کے نزدیک تعلیم کے مقاصد کیا ہیں ؟
10 ۔ ابن سینا کے تصورات کی روشنی میں عقلیاتی علوم کو نصاب میں مرکزیت حاصل ہو گی ۔ بحث کیجیے ۔
11 ۔ ابن سینا کی تقسیم علوم پر مختصر نوٹ لکھیے ۔
12 ۔ زرنوجی کے تدریج نصاب کے تصور پر مختصر نوٹ لکھیے ۔
13 ۔ زرنوجی کے بیان کردہ مطالعے کے طریقوں کی وضاحت کیجیے ۔
14 ۔ ابن جماعہ اور زرنوجی کے نزدیک اچھے متعلم کے اوصاف کیا ہیں ؟
15 ۔ ابن جماعہ کی رائے میں خطابی طریق کے موثر استعمال کی تدابیر بیان کیجیے ۔
16 ۔ فن تدریس اور اوصاف معلم کے متعلق ابن جماعہ کے بیان کردہ اصولوں کی نشان دہی کیجیے ۔
17 ۔ مندرجہ ذیل بیانات میں سے صحیح بیانات کے سامنے ص اور غلط کے سامنے غ کے گرد دائرہ لگائیے ۔

i ۔ پیشہ ورانہ روابط تذکرۃ السامع کا خاص موضوع ہے ۔ ص غ

ii ۔ ابن سینا منطقی استدلال کو علم کا سب سے معتبر ذریعہ سمجھتے ہیں ۔ ص غ

iii ۔ ابن سینا کے نزدیک انسانی قوتوں کا مرکز دل ہے ۔ ص غ

iv ۔ ابن سینا نفس کو مادے کی آلائش سے پاک کرنے پر زور دیتے ہیں ۔ لیکن اس سے ان کا مطب یہ نہیں کہ دنیا کو ترک کر دیا جائے ۔ ص غ

v ۔ ابن سینا کے نزدیک منطق اعلیٰ علوم کے زمرے میں شامل ہے ۔ ص غ

vi ۔ زرنوجی کی کتاب "تعلیم المتعلم" میں کوئی خاص فلسفہ پیش نہیں کیا گیا ۔ ص غ

vii ۔ زرنوجی کے نزدیک نصاب میں قرآن و حدیث کی باری فقہ اور اصول فقہ کے بعد آئے گی ۔ ص غ

viii ۔ زرنوجی مضامین کے انتخاب میں فیصلے کا آخری حق متعلم کو دیتے ہیں ۔ ص غ

ix ۔ طریقِ مطالعہ میں زرنوجی فہم سے زیادہ حفظ پر زور دیتے ہیں ۔ ص غ

x ۔ زرنوجی کے نزدیک سوالات کرنا ایک مہینے کی رٹے بازی سے بہتر ہے ۔ ص غ

xi ۔ طلبہ کے کسی سوال کا صحیح جواب نہ بھی آتا ہو تو استاد کو کوئی گول مول جواب دے کر اپنی بے علمی پر پردہ ڈال لینا چاہیے تاکہ استاد کے متعلق طلبا کا اعتماد ڈگمگا نہ جائے ۔ ص غ

18- درج ذیل بیانات میں خالی جگہوں کو پُر کیجیے ۔

i ۔ ابنِ سینا کے نزدیک تدریسی حکمت عملی میں -------- طریق تدریس کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ۔

ii ۔ زرنوجی کے نزدیک تعلیم کا نصب العین ---------- ہے ۔

iii ۔ زرنوجی کے نزدیک مطالعے کے لیے دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ---------- کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔

iv ۔ زرنوجی کے نزدیک انسانی عمر کا -------- کا دور تعلیم کے لیے زیادہ موزوں ہے ۔

v ۔ تعلم کی پختگی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ حاصل شدہ علم کی تحریری ---------- کی جائے ۔

ساتواں باب

نصابِ تعلیم

نصاب کا مفہوم

تاریخ کے مختلف ادوار میں نصاب کا مفہوم مختلف رہا ہے ۔ ایک وقت تھا کہ کسی ایک جماعت کے لیے منتخب مجموعہ مضامین کو نصاب کہا جاتا تھا ۔ یہ انتہائی محدود تصور تھا ۔ ہم اس مجموعہ مضامین کو مطالعہ کا ایک پروگرام یا نصاب کا ایک حصہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن نصاب نہیں ۔ ایک دوسرے تصور کے مطابق کسی خاص پیشے سے متعلق مضامین کی فہرست کتب کو اس پیشے کا نصاب کہا جاتا تھا ۔ مثلاً زرعی کورس کے متعلق تمام مجموعہ کتب کے لیے زرعی نصاب اور اسی طرح صنعتی نصاب یا تجارتی نصاب کی اصطلاح استعمال ہوتی رہی ہے ۔ یہ تصور بھی صحیح نہیں ہے ۔ درحقیقت ان دونوں تصورات میں نصاب کو صرف کتابی علم ہی تک محدود قرار دیا گیا ہے ۔ جدید تصور کے مطابق نصاب کا مفہوم اس سے کہیں مختلف ہے ۔ جدید تصور کے مطابق نصاب علوم و تجربات کا وہ مجموعہ ہے جو مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے مدرسے کے زیر اہتمام طلبہ کے لیے فراہم کیا جاتا ہے خواہ یہ سکول کے اندر ہوں یا باہر ۔

مدرسے کے پیش نظر دو بنیادی چیزیں ہوتی ہیں ۔ طالب علم کی شخصیت کی ہمہ پہلو تربیت اور معاشرے کی اجتماعی ضروریات کی تکمیل اور یہ مقاصد صرف کتابیں پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہو سکتے ۔ مدرسے کو درسی کتب کے علاوہ بھی مختلف اقسام کی سرگرمیوں کا اہتمام کرنا پڑتا ہے ، جو کتابوں سے حاصل کردہ علم کو عملی شکل دے سکیں اور اسے طلبہ کی شخصیت کا جزو بنا دیں ۔ نیز طلبا کے اخلاق و عمل کو صحیح علم کے معیاروں کے مطابق تشکیل دے سکیں اور اسے طلبہ کی شخصیت کا جز بنا دیں ۔

ظاہر ہے کہ مدرسے کی یہ سرگرمیاں صرف عمارت مدرسہ کی حدود تک ہی محدود نہیں رہتیں بلکہ کھیل کے میدان ، صنعتی منصوبے ، قدرتی مناظر اور دیگر معاشرتی تقاریب بھی اس میں شامل ہیں اور یہ سب نصاب کا حصہ ہیں ۔ اس لحاظ سے وہ تمام سرگرمیاں جو سکول کی زیر نگرانی سکول کے اندر ہوں یا سکول سے باہر، کھیل کے میدان میں ہوں یا کسی دوسرے مقام پر ، سب نصاب کا حصہ ہیں ۔ دوسرے الفاظ میں نصاب ان تمام سرگرمیوں ، تجربات، مہارتوں ، رجحانات ، علوم اور تحقیقات پر مشتمل ہوتا ہے. جو مدرسے کے زیر اہتمام بچوں کی ذہنی ، اخلاقی ، سماجی ، روحانی اور معاشی کردار و سیرت کی تعبیر کرتی ہے ۔ اس اعتبار سے نصاب سازی کسی فرد واحد کا کام نہیں رہ جاتا بلکہ اس کی تدوین میں اساتذہ ، انتظامیہ اور معاشرہ سب مل کر حصہ لیتے ہیں ۔

نصاب کی اہمیت

آج کا دور ایجادات اور معلومات کا دور ہے ۔ سائنسی اور صنعتی ایجادات کی بھرمار نے انسانی سوچ اور عمل کو یکسر تبدیل کر دیا ہے ۔ عوام میں خوب سے خوب تر کے حصول کی خواہش بڑھتی جا رہی ہے اور پرانی اقدار و معیار کے متعلق ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں ۔ چند سال قبل بعض چیزیں تعیش کا سامان سمجھی جاتی تھیں ۔ آج وہ معاشرے کی ضرورت بن گئی ہیں ۔ ہر شخص اپنی زندگی کے معیار کو بہتر بنانے کا خواہاں ہے ۔ ان حالات میں ماہرین تعلیم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ آئندہ کے لیے طلبہ کو کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہو گی اور موجودہ نظام میں سے کن کن غیر ضروری باتوں کو خارج کرنا ہو گا اور کن عوامل کو بروئے کار لا کر ایسے تربیت یافتہ افراد پیدا کیے جا سکتے ہیں جو جدید معاشرے کے ہر شعبۂ زندگی کی تعمیر و ترقی میں مد و معاون ثابت ہوں ۔ ان مطلوبہ مقاصد کے حصول کا انحصار اسی عمل پر ہے کہ جدید تقاضوں کے حسبِ حال نصاب تعلیم تیار کر دیا جائے۔

کسی بھی تعلیمی عمل میں نصاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ پورے نظام تعلیم میں طلبہ مرکزی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جن کی ہمہ پہلو تعلیم و تربیت کے لیے نظام قائم کیا جاتا ہے ۔ اگر طلبہ نہ ہوں تو نظام تعلیم کی ضرورت ہی نہیں رہتی ۔ نظام تعلیم کے قیام کے سلسلے میں نصاب کو اساسی حیثیت حاصل ہے ۔ اگر نصاب نہ ہو تو دیگر تمام تعلیمی عوامل مثلاً اساتذہ ، طلبہ ، عمارت ، فرنیچر اور دیگر تعلیمی سازوسامان سب بے مقصد اور بیکار ہو جاتے ہیں ۔

یہ نصاب ہی ہے جس پر عمل کر کے طلبہ اور معاشرے کی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں ۔

ہر معاشرہ اپنے افراد کو بہتر سے بہتر سہولتیں فراہم کر کے اپنی اخلاقی ، معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے لیے کارکن تیار کرنا چاہتا ہے اور اپنے اجتماعی مفادات و مقاصد کے حصول کے لیے تعلیمی مقاصد متعین کرتا ہے اور ان مقاصد کی تکمیل نصاب ہی کے ذریعے ہوتی ہے ۔

اقوام عالم میں ایک ہی قسم کا معاشرہ نہیں ہے بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں معاشرے کی نوعیت الگ الگ ہے ، جن کا اپنا اپنا فلسفۂ حیات ہے ۔ ان کی سیاست ، مذہب اور ثقافت تک الگ ہیں ۔ یہاں تک کہ رسومات ، روایات اور اخلاقی اقدار تک الگ الگ ہیں ۔ ہر معاشرہ اپنی خصوصیات اپنی آئندہ نسلوں کو نہ صرف منتقل کرنا چاہتا ہے بلکہ دیگر ترقی یافتہ معاشروں کے شانہ بشانہ برق رفتاری سے ترقی کی منازل طے کرنے کا خواہش مند بھی ہوتا ہے اور ان خواہشات کی تکمیل تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ۔ تعلیمی انتظامات معاشرہ فراہم کرتا ہے اور تعلیمی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے نصاب سازی کی جاتی ہے تاکہ حصول مقاصد کے لیے تعلیمی عمل میں تسلسل اور آسانیاں پیدا ہوں ۔

تعلیمی ادارے معاشرے کی پوری ایک نسل کی ذہنی ، جسمانی ، فنی اخلاقی اور روحانی تربیت کا انتظام کرتے ہیں تاکہ آئندہ زندگی میں یہ نسل معاشرے کی ترقی و خوشحالی میں نمایاں کردار ادا کر سکے ۔ تربیت کی یہ تمام اقسام تعلیم کے زمرے میں آتی ہیں اور نصاب کے بغیر تعلیم کا تصور ہی ادھورا رہ جاتا ہے کیونکہ اگر تعلیمی عمل سے نصاب کو خارج کر دیا جائے تو پورا تعلیمی ڈھانچہ ہی منہدم ہو جاتا ہے ۔

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں علم کی بہت سی شاخیں ہیں اور طلبہ کے لیے تمام شاخوں کے علوم کا احاطہ کرنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے ۔ ان علوم کو افراد تک پہنچانے کے لیے منتخب مضامین کا انتخاب لوازمہ نصاب میں شامل کیا جاتا ہے ۔ یہ نصاب نہ صرف طلبہ میں مختلف علوم کا فہم پیدا کرتا ہے بلکہ اس کے ذریعے طلبہ کی ذہنی ، معاشرتی ، جذباتی اور جسمانی ترقی کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے ۔

تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے لہٰذا نظام تعلیم کی اچھائی یا برائی کا جائزہ لینے کے لیے معاشرے کے ہر شعبۂ زندگی کی خصوصیات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اور تقریباً یہی کیفیت نصاب تعلیم کی ہے ۔ چونکہ نصاب تعلیمی مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اس لیے نصاب سازی میں ان تمام عوامل کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے جو اس پر اثرانداز ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں ۔ اس سلسلے میں عمرانی اور نفسیاتی عوامل دونوں انتہائی اہم ہیں ان میں سے کسی کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ۔

عمرانی عوامل نصاب کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان عوامل میں بچّے کے گھر اور مدرسے کا ماحول ، رسوم و رواج ، سماجی اقدار ، فلسفہ زندگی اور معاشی تبدیلیاں وغیرہ شامل ہیں ۔ نصاب سازی کے وقت ماہرین تعلیم اور اساتذہ کا یہ فرض ہے کہ ان عمرانی عوامل کو پیش نظر رکھیں ۔ اگر نصاب اچھا ہوگا تو یقیناً اس کے اثرات بچے کی شخصیت پر خوشگوار ہوں گے ۔ بصورت دیگر غیر معیاری نصاب بچے کی مجموعی نشوونما کے لیے مضر بھی ہو سکتا ہے ۔

نصاب سازی میں دوسری اہم چیز بچے کی اپنی شخصیت ، اس کے نفسیاتی تقاضے اور عمر ہے ۔ بچے جسمانی ، مالی ، معاشی اور ذہنی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں ، اس لیے ضروری ہے کہ نصاب سازی کے وقت اس اختلاف کو پیش نظر رکھا جائے ۔

اچھے نصاب کی خصوصیات

1 ۔ سماجی شعور کی نشوونما :

ہر بچہ اپنی پیدائش سے لے کر زندگی کے آخری سانس تک معاشرے ہی میں رہتا

ہے ۔ یہ فرد کی خواہش بھی ہے اور مجبوری بھی ۔ معاشرے میں بہتر زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ فرد میں وہ تمام خصوصیات موجود ہوں جن کی بنا پر وہ معاشرے میں اپنے لیے اچھا مقام پیدا کر سکے ۔ نصاب تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ طالب علم میں معاشری تقاضوں کے مطابق مطلوبہ خصوصیات پیدا کرنے کے لیے وسائل مہیا کرے ۔ اس لحاظ سے نصاب میں ایسی سرگرمیاں شامل کی جائیں جو مدرسے میں ایک چھوٹا سا معاشرہ قائم کر سکیں ۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مختلف تقریبات کے ذریعے طلبہ میں باہمی ربط و تعاون کی فضا پیدا کی جا سکتی ہے ۔

2 ۔ معاشرتی روابط کی تربیت

معاشرتی روابط میں بچے کا گھریلو ماحول مرکزی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس کا اثر بچے کی شخصیت پر بہت گہرا ہوتا ہے لہٰذا نصاب سازی میں بچے کے گھریلو ماحول کو کبھی نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیے ۔ اور گھریلو ماحول کا بہتر فہم و شعور حاصل کرنے کے لیے بچے کے والدین سے انفرادی اور اجتماعی روابط بہت سود مند ثابت ہوتے ہیں ۔ مدرسے میں ان روابط کا انتظام اساتذہ اور والدین کی انجمن بنا کر اور دیگر تقریبات میں والدین کو مدعو کر کے کیا جا سکتا ہے ۔ اس طرح سے مدرسے اور معاشرے میں براہ راست رابطہ رہے گا جو یقیناً تعلیمی عمل پر خوشگوار اثرات مرتب کرے گا ۔ اس کے علاوہ بچوں کو مختلف اداروں اور تاریخی مقامات پر لے جا کر ان کے ذاتی تجربات میں اضافہ کے لیے بھی نصاب میں گنجائش رکھنا ضروری ہے ۔

3 ۔ انفرادی نشوونما

بچہ کسی نہ کسی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے ۔ بعض میں یہ فرق نمایاں ہوتا ہے اور بعض میں معمولی ۔ اس طرح سے بچوں کی استعداد اور ان کی دلچسپیاں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں ۔ تعلیم کا بنیادی مقصد ہر طالب علم کی ہر پہلو سے بھرپور نشوونما ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب استاد ہر بچے کی ذات کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہو اور اگر استاد کو بچے کی خوبیوں اور خامیوں کا علم نہیں ہو گا تو اس کی تدریس کے مقاصد کبھی بھی پورے نہیں ہونگے اور اگر استاد بچے کی صلاحیت اور دلچسپیوں کو پیش نظر رکھ

کر تعلیم دے گا تو یقیناً نتائج خوشگوار ہونگے ۔ اس لئے ضروری ہے کہ استاد اور طالب علم میں اپنائیت کا جذبہ موجود ہو ۔ استاد بچے کے والدین سے رابطہ رکھے اور بچے کی ذات کے بارے میں ان سے معلومات حاصل کرتا رہے ۔ مدرسے کو چاہیے کہ بچوں کی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ہر قسم کے بچے کے لیے نصاب میں اتنی لچک پیدا کرے کہ ہر بچہ اس سے استفادہ کر سکے ۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک اچھے نصاب میں ان تمام عناصر کا ایسا متوازن امتزاج ہونا چاہیے جن میں عمرانی ، نفسیاتی عوامل ، سیاسی و نظریاتی تصورات ، مذہبی و اخلاقی اقدار اور معاشی و ثقافتی عناصر کو مناسب طور پر سمو دیا گیا ہو ۔

نصاب کے عناصر

جیسا کہ نصاب کے مفہوم سے ظاہر ہے کہ نصاب میں وہ تمام سرگرمیاں اور تجربات شامل ہوں جو مطلوبہ مقاصد کے حصول اور طلبا کی تعلیم و تربیت کے لیے سکول کے زیر اہتمام سکول کے اندر یا باہر کسی بھی جگہ وقوع پذیر ہوں ۔ نصاب کی اس وسعت کے حوالے سے ماہرین تعلیم نے نصاب کے درج ذیل چار اجزائے ترکیبی یا عناصر قرار دیئے ہیں ۔

1 ۔ مقاصدِ تعلیم

2 ۔ لوازمۂ نصاب (موادِ نصاب)

3 ۔ طریقِ تدریس

4 ۔ اکتسابی جائزہ

1 ۔ مقاصدِ تعلیم :

نصاب سازی کا تمام تر دار و مدار مقاصدِ تعلیم پر ہے اور مقاصدِ تعلیم کا تعین معاشرہ کرتا ہے ۔ جس قسم کا معاشرہ اور اس کی اقدار ہوں گی اسی قسم کے مقاصدِ تعلیم ہوں گے

اور انھی کے پیش نظر نصاب سازی کی جائے گی ۔ مثلاً ایک صنعتی معاشرے اور زرعی معاشرے کے مقاصد تعلیم میں واضح فرق ہونا ضروری ہے ۔ اسی لیے کسی صنعتی معاشرے کی ضروریات کے تحت تیار شدہ نصاب زرعی معاشرے کے لیے سود مند ثابت نہیں ہو سکتا ۔ اسی طرح زرعی معاشرہ کا نصاب صنعتی معاشرے کے لیے بے کار ہو گا ۔ بعض اوقات علاقائی حالات بھی تعلیمی مقاصد کو متاثر کرتے ہیں ، اس لیے ضروری ہے کہ نصاب سازی کے وقت اس امر کو پیش نظر رکھا جائے ۔

مقاصد ہی کو پیش نظر رکھ کر دیگر عناصر یعنی مواد نصاب ، اساتذہ ، مدرسہ کی عمارت ، کتب کی فراہمی اور تجربہ گاہوں کے سامان کا انتظام کیا جاتا ہے ۔ اس حقیقت کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ لوازمۂ نصاب کی حیثیت ایک شاہراہ کی ہے ۔ جس پر طالب علم کو چلنا ہوتا ہے اور مقاصد تعلیم کو نشانات منزل کی حیثیت حاصل ہوتی ہے ۔ یہی نشانات منزل راہرو کے اسلوب سفر کا تعین کرتے ہیں ۔ بلکہ خود شاہراہ کی نوعیت کا انحصار بھی نشانات منزل پر ہوتا ہے ۔ اس سے نصاب اور مقاصد کے باہمی تعلق کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے ۔

2 ۔ لوازمۂ نصاب:

تعلیمی اداروں میں جو علم ، مہارتیں ، رویے اور اقدار طلبہ کو فراہم کی جاتی ہیں وہ سب نصابی مواد میں شامل ہوتی ہیں ۔ عام طور پر تعلیمی اداروں میں نصاب کو مضامین کی بنیاد پر مرتب کیا جاتا ہے ۔

نصاب سازی میں مواد کے انتخاب کا طریقہ انتہائی مشکل ہے ۔ ماہر نصاب کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس وسیع معلومات ہوں ۔ وہ طلبہ کی ضروریات اور دلچسپیوں کا علم رکھتا ہو اور ان معاشرتی تقاضوں ، اقدار اور روایات سے بھی واقف ہو جو طلبہ کی انفرادی اور اجتماعی نشوونما پر اثر انداز ہوتی ہیں ۔

مقاصد کے تعین کے بعد نفسِ مضمون کا انتخاب کیا جاتا ہے ۔ اور یہ انتخاب مقاصد اور بچوں کے ذہنی معیار کے مطابق ہوتا ہے ۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں علم تیزی سے بڑھ

رہا ہے اور معلومات میں شدت سے اضافہ ہو رہا ہے ۔ اس کے پیش نظر ماہرین کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ علوم کے ذخیرہ سے کون سے اجزا نصاب میں شامل کریں اور کن اجزا کو نظر انداز کر دیں ۔ ویسے بھی کسی ایک جماعت کے لیے کسی ایک مضمون میں اس کا تمام کا تمام مواد شامل نہیں کیا جا سکتا ۔ اس لیے ضروری ہے کہ ماہرین نصاب نفس مضمون کی مختلف جماعتوں میں اس طرح تقسیم کریں کہ وہ طلبہ کی ذہنی سطح ، عمر اور اہلیت سے مطابقت رکھتا ہو ۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ نصاب میں شامل تعلیمی مواد میں تسلسل بھی قائم رہے ۔

نصابی مواد کا انتخاب کرتے ہوئے ایسی سرگرمیوں کا انتخاب کیا جانا چاہیے :

i ۔ جو طلبہ کی ضروریات کی تکمیل کریں ۔

ii ۔ آئندہ نسل کی بقا اور استحکام کی ضامن ہوں ۔

iii ۔ جن سے طلبہ میں بہتر سماجی روابط قائم ہوں ۔

iv ۔ جو فارغ وقت کے بہتر مصرف کے لیے تحریک اور مواقع مہیا کریں ۔

v ۔ جو آئندہ زندگی میں روزگار کی فراہمی کا ذریعہ بنیں ۔

3 ۔ طریقِ تدریس:

طلبہ اور نصاب کے ساتھ ساتھ ایک نہایت اہم عنصر اساتذہ ہیں ۔ اگر تعلیمی عمل کے تمام عناصر موجود ہوں لیکن نصاب کو عملی جامہ پہنانے والے یعنی اساتذہ نہ ہوں تو تمام سکیمیں دھری کی دھری رہ جائیں ۔ لیکن استاد بھی اس وقت ایک اچھا استاد ثابت ہو سکتا ہے جب اس کے پاس تدریس کے لیے باقاعدہ ایک لائحہ عمل یعنی نصاب موجود ہو ۔ نصاب تعلیم کے بغیر استاد کے سامنے کوئی منزل نہیں ہو گی اور نہ ہی اسے نفس مضمون کی حدود کا علم ہو گا اور نتیجہ یہ ہو گا کہ طلبہ بھی اپنے مقاصدِ تعلیم سے بے بہرہ رہ جائیں گے ۔

دراصل نصاب طلبہ کی عملی سرگرمیوں کی وہ تمام تفصیلات پیش کرتا ہے جنھیں سامنے رکھ کر استاد طلبہ کے لیے اسباق اور دیگر سرگرمیوں کی تفصیلات طے کرتا ہے ۔ اپنے اسباق کے اہم نکات مرتب کرتا ہے اور تدریسی معاونات فراہم کرتا ہے ۔ دوران تدریس میں پیش

آنے والی مشکلات اور رکاوٹوں کے ازالے کا بندوبست کرتا ہے ۔ ایک اچھے نصابی خاکے میں ان سب مسائل کی نشاندہی کی جانی چاہیے ۔ اس سے استاد کو اپنے لیے واضح لائحہ عمل متعین کرنے میں سہولت ہوگی ۔

نصاب تعلیم میں متعلم کی عمر ، صلاحیت اور استعداد کے مطابق مواد اکٹھا کیا جاتا ہے جو استاد کے لیے راہ عمل متعین کرتا ہے ۔ نصاب ہی کے ذریعے استاد کو معلوم ہوتا ہے کہ مختلف درجوں کے بچوں کی انفرادی خصوصیات اور علمی معیار کے مطابق کون سا مواد سے اور کس طریقے سے پڑھانا ہے ۔ اس عمل سے اساتذہ کی تدریسی اہلیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی تدریس میں بھی آسانی پیدا ہوتی ہے گویا نصاب میں مواد کے علاوہ ان طریقوں کی نشاندہی بھی کی جاتی ہے جو مواد تدریس کی موزوں اور موثر پیش کش میں معاون ہو سکتے ہیں ۔ ان طریقہ ہائے تدریس میں طلبہ کے اختلاف طبع ، مواد تدریس کی ضروریات اور مخصوص مقاصد کے حصول کی مناسبت سے تبدیلی کی گنجائش کا بھی ذکر کیا جاتا ہے ۔ اس بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مواد نصاب اور طریق لازم و ملزوم ہیں ۔ ان دونوں کو کسی بھی طرح ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ عمل تعلیم کے دوران دونوں اجزا کا تعلق طلبا اور اساتذہ سے قائم رہتا ہے ۔

آج تعلیمی میدان میں مختلف اقسام کے تدریسی طریقے دریافت ہو چکے ہیں ، جن کو ان کی ضروریات اور افادیت کے مطابق استعمال کیا جاتا ہے ۔ یہاں یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ کوئی بھی ایک طریقۂ تدریس سو فیصد درست یا بہترین نہیں ہوتا ۔ بلکہ مختلف طریقۂ تدریس مختلف صورتوں میں بہتر ثابت ہو سکتے ہیں ۔ ایک اچھے نصابی خاکے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مواد نصاب اور مقاصد تعلیم کے حوالے سے تدریسی حکمت عملی کے رہنما خطوط درج کر دیے جاتے ہیں ۔

4 ۔ اکتسابی جائزہ :

تعلیمی مقاصد کی روشنی میں اور اساتذہ کی رہنمائی میں بچوں کی تربیت کے لیے نصاب کے مطابق عمل تدریس و تعلم تعلیمی اداروں کی نگرانی میں مختلف ادوار میں جاری رہتا ہے ، جس کے لیے معاشرہ اپنا قیمتی سرمایہ اور وقت صرف کرتا ہے ۔ ان انتظامات کے بعد بچوں

کے والدین ، معاشرہ اور اساتذہ یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ جن مقاصد کے لیے یہ سب تگ و دو کی گئی تھی ان کے حصول میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے ۔ طلبہ نے دوران تعلیم سکول کی سہولتوں سے کیا فوائد حاصل کیے ۔ عمل تدریس کا معیار کیا ہے اور مواد نصاب طلبہ کے لیے کہاں تک سود مند ثابت ہوا ہے ۔ یہ سب کچھ جانچنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ۔ نتائج کو جانچنے کے یہ طریقے اکتسابی جائزہ کے تحت آتے ہیں ۔ یہ نتائج عام طور سے تین اقسام میں تقسیم کیے جاتے ہیں ۔

1 ۔ وقوفی پہلو: جس کا تعلق معلومات اور تصورات سے ہوتا ہے ۔

2 ۔ تاثری پہلو: جس کا تعلق عادت اور رویوں کی تشکیل سے ہوتا ہے ۔

3 ۔ مہارتی پہلو: جس کا تعلق کسی ہنر کے اکتساب سے ہوتا ہے ۔

ان تینوں پہلوؤں کا جائزہ ، نصاب ، اساتذہ اور دیگر سہولتوں کو جانچنے میں مدد دیتا ہے ۔ گویا جائزہ ایک ایسی سرگرمی ہے جس سے حاصل کردہ نتائج طلبہ کے اکتساب میں خوبیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کرنے کے علاوہ نصاب کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی عیاں کرتے ہیں ۔ اسی طرح اکتسابی جائزہ آئندہ نصاب سازی میں بھی بہت اہم کردار ادا کرتا ہے اور یوں نصاب سازی کے عمل کا اہم حصّہ بن جاتا ہے ۔ نصاب کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کا اندازہ لگانے کے لیے طلبہ کے تعلم کا جائزہ لیا جاتا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ مدارس میں رائج نصاب سے طلبہ نے کیا کچھ سیکھا ہے اور ان کی شخصیت میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ۔

تعلیم کے جن نتائج کا تعلق طلبہ کی اخلاقی ، روحانی اور معاشرتی نشوونما سے ہے ان کو پرکھنے کا کوئی معیاری پیمانہ موجود نہیں ہے ۔ ان خصوصیات کا اظہار خاص خاص اوقات پر بھی ہوتا ہے مثلاً قربانی اور خدمت کے جذبے کا اظہار مدرسے کے عام حالات میں تقریباً ناممکن ہے ۔ تاہم طالب علم کے مہذب و ملنسار اور بردبار ہونے یا نہ ہونے کا مشاہدہ ایک تجربہ کار استاد کرتا رہتا ہے ۔

دوسری قسم کی تبدیلیوں کا تعلق مدرسے کے نصاب میں شامل مختلف مضامین میں حاصل کردہ معلومات اور مہارتوں سے ہے۔ چونکہ یہ تمام مواد نصاب میں موجود ہوتا ہے اس لیے اس کا صحیح طور پر جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اس اکتسابی جائزے کے لیے تعلیمی اداروں میں امتحانات کا ایک نظام قائم ہے جس کے تحت طے شدہ وقفوں سے امتحانات منعقد کر کے طلبہ کی حاصل کردہ معلومات اور مہارتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

اکتسابی جائزہ کے ذریعے حاصل کردہ نتائج نہ صرف طلبہ کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ ان کی مدد سے نفس مضمون میں شامل اجزا کے معیار کو پرکھنے اور طریق تدریس کو زیادہ بہتر بنانے میں بھی مدد ملتی ہے۔

موثر تدریس کی خصوصیات

عملِ تدریس :

تدریس ایک ایسا عمل ہے جس سے مخصوص نتائج حاصل کیے جاتے ہیں۔ یہ عمل متعلم، نصاب تعلیم، معلم اور معلم کی تدریسی تدابیر پر مشتمل ہوتا ہے۔ معلم مختلف طریقۂ تدریس اختیار کر کے طلبہ کو مطلوبہ رویے، تصورات اور مہارتیں سکھاتا ہے۔ گویا عمل تدریس، نصابِ تعلیم اور عمل تعلم میں باہم رابطے کا ذریعہ ہے۔ نیز عمل تدریس ہی معلم اور متعلم میں باہم رابطے کا ذریعہ ہے۔ اگر ان اجزا میں سے کسی ایک کو بھی خارج کر دیا جائے تو ان میں سے کسی کا وجود بھی قائم نہیں رہے گا۔

عملِ تدریس کے موثر یا غیر موثر ہونے کا زیادہ تر دارومدار معلم کی شخصیت، اس کے کردار، جذبۂ خدمت، مہارت مضمون، طریقۂ تدریس اور اس کی ذاتی کاوشوں پر ہے۔ معلم کا کام طلبہ کو صرف لکھنا پڑھنا سکھانا ہی نہیں بلکہ اس پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ طلبہ میں ایسی خصوصیات اور صلاحیتیں پیدا کرے کہ وہ پُرسکون خوشگوار اور بامقصد زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں۔ ان میں مل جل کر رہنے، کام کرنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا جذبہ بھی پیدا ہو اور ساتھ ہی ان میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی اہلیت

اور احساس پیدا کیا جائے تا کہ وہ معاشرہ میں اپنے لیے کوئی باعزت مقام پیدا کر سکیں۔

معلم کو ایک تجربہ کار شخص ہونا چاہیے تا کہ وہ طلبہ کی ذہنی اور اخلاقی رہنمائی کر سکے۔ بہتر تدریس کے متعلق یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ طلبہ کی تربیت کے لیے معلم کی اپنی شخصیت مثالی ہونی چاہیے تا کہ اس کا اپنا کردار طلبہ کے لیے ایک نمونہ ہو جس کی وہ پیروی کر سکیں۔ طلبہ اور معلم کے باہمی تعلقات خوشگوار ہونے چاہئیں تا کہ معلم کو متعلم کے ہر پہلو کو سمجھنے کے بہتر مواقع حاصل ہو سکیں اور جن کی بنا پر معلم عمل تدریس کو مزید بہتر بنا سکے۔

موثر تدریس: موثر تدریس کامیابی کا وہ معیار ہے جس سے معلم اپنی تدریس کے ذریعے مطلوبہ تعلیمی مقاصد حاصل کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ایک معلم، طلبہ کی شخصیت کی نشوونما کے لیے اپنے مقاصد میں جتنا زیادہ کامیاب ہوتا ہے اس کا عمل تدریس اتنا ہی موثر ہے۔ ماہرین تعلیم کے نزدیک ایک اچھے مدرس کی درج ذیل خصوصیات موثر تدریس کی نشاندہی کر سکتی ہیں۔

1۔ مستعدی اور سوجھ بوجھ:

ایسے اساتذہ جو مستعد اور چاق و چوبند ہوں اور سوجھ بوجھ سے کام لیں ان کی تدریس زیادہ موثر ہوتی ہے بمقابلہ ان اساتذہ کے جو سُست رو ہوں اور سوجھ بوجھ سے عاری ہوں۔

2۔ منظم اور محتاط انداز کار:

موثر تدریس کے لیے مدرس میں تنظیمی صلاحیت اور تدریس میں محتاط انداز کار یعنی حصول مقصد کے لیے تگ و دو کی صلاحیت کا ہونا بہت اہم ہیں۔ اس کے برعکس اگر مدرس میں تنظیمی صلاحیت کا فقدان ہو اور وہ غیر محتاط بھی ہو تو اس سے بھی اچھی تدریس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

3۔ محرک اور پُر تخیل:

مدرس میں خوب سے خوب تر کی خواہش اور طلبہ میں کام کرنے کی تحریک پیدا کرنے

کی خوبی موثر تدریس کے بنیادی عناصر ہیں ۔ اگر مدرس سست اور کاہل ہو اور فرسودہ طریق کار کا ہی پابند رہے تو موثر تدریس کی توقع عبث ہے ۔

تدریس اور منصوبہ بندی

تدریس اپنے مفہوم کے اعتبار سے منصوبہ بندی ہی کا دوسرا نام ہے ۔ چنانچہ تدریس کے لیے معیاری منصوبہ بندی اور اس پر دانشمندانہ عمل درآمد ضروری ہے اور اس نقطۂ نظر سے ماہرین تعلیم نے درج ذیل اہم نکات کی نشاندہی کی ہے ۔

1 ۔ نفس مضمون کا انتخاب
2 ۔ سبق کے مقاصد کا تعین
3 ۔ تدریس کا انتخاب
4 ۔ طلبہ کی واقفیت کا جائزہ
5 ۔ استحضار
6 ۔ جائزہ

1 ۔ نفسِ مضمون کا انتخاب :

یہ انتخاب طلبہ کی دلچسپیوں اور ان کی ضروریات کے مطابق کیا جانا چاہیے لیکن عام طور پر مدرس اس انتخاب کے معاملے میں آزاد نہیں ہوتا ۔ اسے پہلے سے تیار کردہ نصاب کے مطابق کام کرنا ہوتا ہے ۔ اس لیے وہ نصاب ہی کے مطابق سبق کا چناؤ کرتا ہے ۔ بہر حال مدرس اپنی صوابدید اور تجربے کی بنیاد پر بہتر نتائج کے لیے اسباق کی ترتیب میں رد و بدل کر سکتا ہے اور اس سبق کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں یا عنوانات کے تحت تقسیم کر سکتا ہے ۔ نیز طلبہ کی دلچسپی کی خاطر اس میں اضافی مواد بھی شامل کر سکتا ہے ۔

2 ۔ سبق کے مقاصد کا تعین :

کسی بھی مضمون کی تدریس کے مخصوص مقاصد تدریس عمومی انداز میں تو پہلے سے

متعین ہوتے ہیں لیکن کسی ایک سبق کے مقاصد کا تعین مدرس خود کرتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ منصوبہ بندی کرتے ہوئے عمومی مقاصد کی روشنی میں سبق کے مخصوص مقاصد کا تعین کرے ۔ یعنی اس کا فیصلہ مدرس کو خود کرنا ہو گا کہ کسی خاص سبق کی تدریس سے طلبہ کی شخصیت پر کیا اثرات مرتب ہونگے اور طلبہ اس کا اظہار کس طرح کریں گے؟

3 ۔ طریقِ تدریس کا انتخاب :

بعض اوقات اساتذہ ایک رائے قائم کر لیتے ہیں کہ ایک خاص طریقۂ تدریس بہترین اور معیاری ہے ۔ اس طرح دوسرے طریقوں کو بالکل اہمیت نہیں دیتے لیکن اگر تمام طریقوں کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ سب طریقے اپنی اپنی جگہ اہم ہیں ۔ معلم کی بصیرت کا امتحان یہ ہے کہ اسے ان متعدد طریقوں میں سے موقع محل کی مناسبت سے کون سا طریقہ استعمال کرنا ہے ۔ کبھی ایسا بھی ہو گا کہ کسی ایک طریقے کی بجائے معلم کو دو یا دو سے زیادہ طریقوں سے کام لینا پڑے گا ۔ چند طریقہ ہائے تدریس کا تعارف ذیل میں دیا جا رہا ہے :

الف) طریقِ تقریر و وضاحتی تدابیر :

تقریباً تمام اسباق میں مدرس کچھ معلومات اور خیالات طلبہ کو بہم پہنچاتا ہے ۔ وہ اپنے سبق میں خاص خاص نکات کی وضاحت کرتا ہے اور مزید تعلم کے لیے طلبہ کو ابھارتا ہے ۔ ایسا کرنے میں مدرس عام طور سے طریقِ تقریر یا لیکچر میتھڈ استعمال کرتا ہے ۔ جدید تحقیق کے مطابق معلم عموماً کل وقت کا تقریباً 70 فیصد وقت خود بولنے میں صرف کرتا ہے ۔ جب کہ ماہرین تعلیم کے مطابق طلبہ کی شمولیت کے بغیر ایک مدرس کو کل وقت کا 10 تا 20 فیصد سے زیادہ حصہ نہیں لینا چاہیے ۔ اپنے لیکچر کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کے لیے سبق میں طلبہ کو شامل کرنا بہت ضروری ہے اور یہ شمولیت وقتاً فوقتاً سوالات کی مدد سے حاصل کی جا سکتی ہے ۔ اس طرح سے معلم طلبہ میں سبق سے متعلق دلچسپی قائم رکھ سکے گا ۔ بصورت دیگر اگر صرف اپنے لیکچر ہی پر بھروسہ کیا گیا تو طلبہ میں بیزاری کی کیفیت پیدا ہونے کا واضح اندیشہ ہے ۔

ب) طریقِ بحث :

اس طریقے میں سوالات اور جوابات کے علاوہ معلم اور طلبہ مختلف نکات پر تبصرہ کرتے ہیں ۔ اس طرح سے طلبہ عملی طور پر سبق میں شامل ہو جاتے ہیں اس طرح سے نہ صرف سبق میں دلچسپی کا عنصر شامل ہو جاتا ہے بلکہ معلم کو طلبہ کی کامیابی اور کامرانی کا اندازہ بھی ہوتا رہتا ہے ۔ طریق بحث سے طلبہ میں کام کرنے کے جذبہ کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی بھی پیدا ہوتی ہے ۔ اس لیے ضروری ہے کہ تدریس کو موثر بنانے کے لیے اسباق کا کچھ نہ کچھ حصہ طلبہ کے اظہار خیالات کے لیے مختص کیا جائے ۔

ج) مسئلی طریق :

اس طریقۂ تدریس میں ہر طالب علم دیے گئے مسئلے کا اپنے طور پر حل تلاش کرتا ہے ۔ مثلاً ، ریاضی میں قواعد و کلیات کی تدریس کے بعد طلبہ کو سوالات دے دیے جاتے ہیں یا پھر سائنس میں طلبہ خود تجربات کرتے ہیں ۔ معلم کا کام ان کے کام کی نگرانی اور ان کی مناسب رہنمائی کرنا ہوتا ہے ۔ بعض اوقات چند طلبہ کے گروپ بنا کر انھیں ایسا کام سونپا جاتا ہے جس پر وہ سب مل کر کام کر سکیں ۔

د) طریقِ تکرار :

انسان میں نسیان کی صفت بھی پائی جاتی ہے یعنی وہ جو کچھ سیکھتا ہے وہ بھول بھی جاتا ہے ۔ اس وجہ سے تعلم کو دیرپا بنانا معلمین کے لیے ایک اہم مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس کے لیے طریق تکرار یا ڈرل میتھڈ سے کام لیا جاتا ہے ۔ مہارتوں کی تحصیل میں یہ طریق خاص طور سے مؤثر ہے ۔

4 ۔ طلبہ کی واقفیت کا جائزہ :

کسی بھی سبق کی منصوبہ بندی کرنے سے پہلے مدرس کے لیے ضروری ہے کہ نئے سبق کو پچھلے اسباق کی روشنی میں ترتیب دے ، یعنی پچھلے اسباق سے اس کا تعلق قائم

کرے ۔ سبق کے چناؤ اور اس کی ترتیب سے پہلے مدرس کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ طلبہ سبق سے متعلق کن کن باتوں سے پہلے ہی واقفیت رکھتے ہیں ۔ دوران تدریس مجوزہ سبق اور سابقہ واقفیت میں یہ تعلق سوالات کے ذریعے قائم کیا جا سکتا ہے ۔

5 ۔ استحضار :

طریقۂ تدریس خواہ کوئی بھی ہو اہم بات یہ ہے کہ مدرس اپنے سبق کو طلبہ کے سامنے کس طرح پیش کرتا ہے ۔ مدرس طلبہ کے سامنے نئے حقائق ، نئے نظریات اور نئے اصول پیش کرتا ہے اور ان کی وضاحت کرتا ہے ۔ اس لیے ضروری ہے کہ سبق کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کی جائے ۔ اس مقصد کے لیے درج ذیل باتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے :

i ۔ طلبہ کو سبق کی طرف متوجہ رکھنے کے لیے طلبہ سے سوالات کیے جائیں ۔ سوالات واضح اور سبق سے متعلق ہونے چاہئیں ۔

ii ۔ مدرس کے تمام جملے واضح اور بامعنی ہوں ۔ ذومعنی اور مبہم فقرات کے استعمال سے پرہیز کیا جائے ۔

iii ۔ کسی خاص لفظ یا جملے کو تکیہ کلام بنانے سے پرہیز کیا جائے ۔

iv ۔ موقع کی مناسبت سے سبق کی وضاحت کے لیے مثالیں دی جائیں ۔

v ۔ سبق کے دوران ضروری نقشہ جات ، چارٹس ، ماڈل اور دیگر سمعی و بصری معاونات استعمال کی جائیں ۔

vi ۔ نیا عنوان شروع کرنے سے پہلے سابقہ واقفیت کا سوالات کے ذریعے اعادہ کرایا جائے ۔

vii ۔ طلبہ کے کام کی تعریف و توصیف کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے ۔

viii ۔ سبق کے اختتام پر مکمل سبق کے خاص خاص نکات کا اعادہ کیا جائے ۔

6 ۔ جائزہ

مؤثر تدریس ہمیشہ بامقصد ہوتی ہے ۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مقصود ہوتا ہے کہ

تدریسی مقاصد کے حصول میں معلم کہاں تک کامیاب رہا ہے؟ معلم کو چاہیے کہ وہ طلبہ کے جوابات یا ردعمل کی روشنی میں سبق کی کامیابی کا جائزہ لے اور اگر ضرورت محسوس ہو تو طریقۂ تدریس اور منصوبہ بندی میں مناسب ترمیم و اصلاح کرے۔

پیمائش

پیمائش کا مفہوم: کسی چیز کی تعداد، مقدار یا خصوصیت کا اندازہ لگانے کا عمل پیمائش کہلاتا ہے۔ کسی چیز کی جسامت کا اندازہ اس کے اجزا کی تعداد یا کارکردگی کا جائزہ، سب پیمائش ہی کی اقسام ہیں۔ جب ہم کوئی چیز خریدتے ہیں تو ہم اس کی مقدار، تعداد، وزن اور خصوصیت کا خیال رکھتے ہیں۔ اس طرح سے پیمائش کا ایک خاص معیار پیش نظر ہوتا ہے۔

پیمائش کی اہمیت:

پیمائش کا تصور اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسانی تہذیب و تمدن۔ ہر دور میں انسان کو کسی نہ کسی صورت میں پیمائش کے مختلف طریقوں سے واسطہ رہا ہے۔ خورد و نوش کے لیے خوراک کا تخمینہ، دیگر ضروریات زندگی کی فراہمی کے لیے اندازے، وقت کی اہمیت کا احساس اور چھوٹے بڑے کی تمیز سب ایسے پیمائشی عناصر ہیں جن کے بغیر انسانی زندگی کا تصور ہی محال ہے یعنی ہر قدم پر انسان پیمائش کا محتاج ہے۔

پیمائشی معیار:

جن اشیا یا عناصر سے ہمیں روزانہ واسطہ پڑتا ہے ان کو پیمائش کے لحاظ سے تین مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1۔ ایسی اشیا جن کی درست پیمائش کی جا سکتی ہے۔ ان اشیاء کا تعلق رائج شدہ معیاری

پیمانوں یعنی میٹر ، کلوگرام ، لٹر اور ہندسوں سے ہے ۔ مثلاً کپڑے کی پیمائش میٹر میں ، چینی کی پیمائش کلوگرام میں ، دودھ کی پیمائش لٹر میں اور رقم کی پیمائش ہندسوں میں ہو سکتی ہے ۔

2 ۔ ایسی صفات جن کی پیمائش کا کوئی معیار مقرر نہیں ۔ اس میں ایسے تصورات ، جذبے اور صفات شامل ہیں جن کا کوئی مادی وجود نہیں ہوتا بلکہ ان کی حیثیت اخلاقی ، روحانی اور جمالیاتی ہوتی ہے ۔ اس پہلو کی پیمائش کے معیار عام طور سے موضوعی ہوتے ہیں اور یوں یہ معیار ہر فرد ، ہر ملک اور ہر قوم میں مختلف ہوتے ہیں ۔ یعنی ایک عمل اگر پاکستان میں بُرا سمجھا جاتا ہے تو عین ممکن ہے کہ اسے مغربی ممالک میں اچھا سمجھا جاتا ہو ۔ اسی طرح ضروری نہیں کہ ہر فرد کے ذہن میں خوبصورتی کا معیار ایک جیسا ہی ہو ۔ تعلیمی میدان میں پیمائش سب سے مشکل ہے لیکن یہ پہلو بہر حال بے حد ضروری ہے ۔

3 ۔ ایسے پہلو جن کی پیمائش اندازاً کی جا سکتی ہے : اس فہرست میں ایسی فعالیتیں شامل ہیں جن کی پیمائش کا دارومدار اس کے نتائج پر ہے ۔ مثلاً کھیل کے میدان میں بہتر ٹیم کا انداز کھیل کے نتائج سے ہی لگایا جائے گا ۔ یعنی میچ میں جیتنے والی ٹیم ہی بہتر تصور کی جائے گی ۔ اسی طرح اچھے ، محنتی اور قابل طالب علم کی کارکردگی کا اندازہ بھی اس کے امتحانی نتائج کی روشنی میں لگایا جاتا ہے ۔

تعلیمی پیمائش : فطری طور پر معلم یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ سیکھنے والے نے کیا کچھ سیکھا ہے ۔ یہ سب جاننے کے لیے آزمائشوں/پیمائشوں کے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ۔ جنھیں عام طور پر امتحانات یا اکتسابی جائزے کا نام دیا جاتا ہے ۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تعلیمی پیمائش کے بغیر نہ طالبعلم اپنا جائزہ لے سکتا ہے اور نہ معلم اپنی کاوشوں کی کامیابی کا اندازہ لگا سکتا ہے ۔

تعلیمی پیمائش کی اہمیت : تعلیمی عمل میں جہاں عملِ تدریس کی اہمیت مسلمہ ہے ۔ وہاں اس عمل سے حاصل کردہ نتائج کی پیمائش کا عمل بھی اُتنا ہی اہم ہے اور یہ عمل امتحان

کہلاتا ہے ۔ کبھی یہ امتحان زبانی ہوتا ہے اور کبھی تحریری ، کبھی دونوں طرح کا ۔ کبھی یہ امتحان طویل ہوتا ہے اور کبھی مختصر ، کبھی یہ امتحان مدرسے کے اساتذہ خود ہی لیتے ہیں اور کبھی بیرونی ادارے ان کا اہتمام کرتے ہیں ۔ گویا امتحانات مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن ان سب کا مقصد طلبہ کی تعلیمی کارکردگی کا اندازہ لگانا ہوتا ہے ۔ ان امتحانات سے حاصل کردہ نتائج طلبہ کی کارکردگی کا مظہر ہوتے ہیں اور ان کی آئندہ زندگی کی راہیں متعین کرنے کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ یہ نتائج کس طرح طلبہ کی زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں ۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے :۔

اگلی جماعت میں ترقی : طالب علم کو ایک جماعت سے اگلی جماعت میں ترقی دینے کے لیے امتحانات کے نتائج ہی کو معیار سمجھا جاتا ہے ۔ طالب علم کی تعلیمی ترقی کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس نے مجوزہ نصاب پر کہاں تک عبور حاصل کیا ہے ۔ اس نظام میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ بعض اوقات اساتذہ بچوں کو صرف امتحانات میں کامیابی کے نظریے سے پڑھانا شروع کر دیتے ہیں اور ان کی دوسری ضروریات کو نظرانداز کر دیتے ہیں ۔ اسی طرح سے اکثر طلبہ بھی کامیابی کے حصول کے پیش نظر ہی اپنی تیاری کرتے ہیں لیکن ان خامیوں کے باوجود بھی امتحانات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ طریقہ امتحان کو بہتر بنایا جائے ۔

2 ۔ پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے انتخاب :

اعلیٰ تعلیمی اداروں خصوصاً پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں مثلاً میڈیکل کالجوں اور انجینیرنگ یونیورسٹی میں صرف انہی امیدواروں کو داخلہ ملتا ہے جنہوں نے اپنے سابقہ بنیادی امتحان میں بہت اچھے نمبر حاصل کیے ہوں ۔ ضروری نہیں کہ اعلیٰ فنی اداروں میں داخلہ کے لیے عمومی تعلیمی معیار بہتر کارکردگی کا ضامن ہو لیکن چونکہ امیدوار کو فنی قابلیت اور خصوصی مہارت کے جانچنے کا کوئی دوسرا معیار موجود نہیں اس لیے انھی نتائج کو بنیاد تصور کیا جاتا ہے ۔

3 ۔ طلبہ کی قابلیت کا جائزہ :

طلبہ کی تعلیمی حالت ہی مستقبل میں کامیابی کی ضامن ہے ۔ اگر کسی طالب علم کی

تعلیمی حالت اچھی نہیں ہے تو اس کا اثر اس کے مستقبل کے منصوبوں پر ضرور پڑے گا ۔ اچھے معلم کا یہ فرض ہے کہ وہ تعلیمی آزمائشوں کی مدد سے طلبہ کو ان کی تعلیمی حالت سے باخبر رکھے اور ان کی خامیوں کو دور کرنے کے لیے ان کی رہنمائی کرے ۔

4 ۔ طریقۂ تدریس کا جائزہ :

امتحانی نتائج جہاں طلبہ کو ان کی قابلیت کے معیار سے آگاہ کرتے ہیں وہاں مدرس کو بھی اپنے طریقہ تدریس کے موثر یا غیر موثر ہونے کی اطلاع دیتے ہیں ۔ بہتر نتائج ہی کو بہتر تدریس کا معیار سمجھا جاتا ہے ۔ اگر نتائج اچھے نہ ہوں تو معلم ہی کو ان خراب نتائج کا ذمہ دار گردانا جاتا ہے ۔ معلم امتحانی نتائج سے خود اپنی کارکردگی کا جائزہ لے کر اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کر سکتا ہے ۔

5 ۔ امتحانات بطور ایک محرک :

یہ درست ہے کہ معلم حصول علم کے لیے اپنے طلبہ کو ترغیب دیتا ہے لیکن اگر طلبہ کے سامنے سے امتحانات کا خوف ہٹ جائے تو اکثر طلبہ تعلیم کی طرف توجہ دینا چھوڑ دیں گے ۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ طلبہ اس وقت زیادہ محنت کرتے ہیں جب امتحانات قریب ہوں ۔ عام حالات میں ان کی توجہ کھیل کود اور دوسرے مشاغل کی طرف زیادہ ہوتی ہے ۔ اگر مدرس تھوڑے تھوڑے وقفوں سے امتحانات لیتا رہے تو یقیناً طلبہ تعلیم کی طرف زیادہ راغب ہونگے ۔

6 ۔ طلبہ کی رہنمائی :

تعلیمی پیمائش ہی ایک ایسا موثر ذریعہ ہے جس کی بناء پر معلم طالب علم کی قابلیت اور اس کے رجحان کا اندازہ لگا کر آئندہ کی منصوبہ بندی کے لیے اسے مناسب مشورہ دے سکتا ہے ۔ عام طور سے ہر بچے کے والدین کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بچہ بڑا ہو کر ڈاکٹر یا انجینئر بنے لیکن ضروری نہیں کہ تمام والدین کی یہ خواہش پوری ہو کیوں کہ عین ممکن ہے کہ بچے کا طبعی رجحان کسی اور طرف ہو ۔ اس سلسلے میں تعلیمی پیمائش کے ذریعے حاصل شدہ

نتائج بچے کی رہنمائی کا ذریعہ بن سکتے ہیں ۔

7 ۔ تعلیمی مقاصد کا حصول :

طلبہ کو مختلف مضامین مختلف مقاصد اور نظریات کے تحت پڑھائے جاتے ہیں یعنی ہر مضمون کے لیے پڑھانے کا کوئی نہ کوئی خاص مقصد ضرور ہوتا ہے ۔ یہ جانچنے کے لیے کہ اس مقصد کے حصول میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے تعلیمی پیمائش یعنی امتحانات ہی سے مدد لی جاتی ہے ۔

8 ۔ تعلیمی اداروں کا معیار :

سالانہ امتحانات (خصوصاً یونیورسٹی اور بورڈ کے امتحانات) کے نتائج ہی کسی تعلیمی ادارے کی اچھی یا بری شہرت کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور یہی نتائج ادارے کی آئندہ بہتر منصوبہ بندی کے لیے سود مند ثابت ہو سکتے ہیں ۔

تعلیمی پیمائش کی اقسام

تعلیمی پیمائش کا تعلق طالب علم کی شخصیت و کردار میں تبدیلیوں سے ہے ، جو مدرسہ میں تعلیمی عمل کے دوران میں واقع ہوتی ہیں ۔ طلبہ میں یہ تبدیلیاں مقاصد تعلیم کی روشنی میں لائی جاتی ہیں اور تعلیمی پیمائش کا کام یہ معلوم کرنا ہے کہ کس طالب علم میں مطلوبہ تبدیلی کہاں تک رونما ہوئی ہے ۔

تعلیمی پیمائش سے پہلے معلم کے لیے فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ اسے طالب علم کی کن کن تبدیلیوں کی پیمائش کرنا ہے اور اس کے لیے کون سے پیمائشی طریقے استعمال کرنے ہیں ۔ کیونکہ ہر قسم کی تبدیلی کے لیے ایک ہی پیمانہ استعمال نہیں کیا جا سکتا ۔ طالبعلم کی شخصیت اور کردار کی تبدیلیاں عموماً سوجھ بوجھ ، سوچ بچار ، مہارتوں ، دلچسپیوں ، رویوں اور ماحول کی مطابقت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اور پیمائش کی اقسام کا تعلق انھی تبدیلیوں سے ہے ۔ تعلیمی پیمائش کی معروف اقسام درج ذیل ہیں :

1 ۔ زبانی امتحانات :

زبانی سوالات کی مدد سے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ طالب علم نے اپنا سبق کہاں تک یاد کیا ہے ۔ جو کچھ طالب علم نے لکھا ہے وہ اسے اچھی طرح سمجھتا بھی ہے کہ نہیں ۔ اس کے علاوہ بعض ایسی چیزیں جو تحریری امتحان سے معلوم نہیں کی جا سکتیں وہ زبانی طور پر پوچھ لی جاتی ہیں ۔ کسی خاص مقصد کے لیے انٹرویو وغیرہ بھی زبانی پیمائش کا ایک طریقہ ہے ۔ اس طریقہ میں چند نقائص بھی ہیں ۔ مثلاً طلبہ کی تعداد اگر بہت زیادہ ہو تو بہت وقت درکار ہو گا ۔ اس کے علاوہ طریقہ پیمائش سے نتائج اخذ کرنے میں ممتحن کی اپنی پسند اور رائے کو بہت دخل حاصل ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ طالب علم کی اپنی شخصیت بھی ممتحن پر اپنا اثر ڈالتی ہے ۔ ان وجوہات کی بنا پر اس طریقۂ پیمائش کا استعمال محدود ہے ۔

2 ۔ روائتی یا انشائی طرز کے امتحانات :

یہ طریقۂ امتحان بہت قدیم ہے اور بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے ۔ اس میں طلبہ تمام سوالات کا جواب تحریری طور پر دیتے ہیں اور انہیں لکھنے کی پوری آزادی حاصل ہوتی ہے ۔ اس طریقۂ پیمائش سے نہ صرف طالب علم کی درسی کتب پر عبور سے متعلق واقفیت کا پتہ چلتا ہے بلکہ طالب علم کی تخلیقی اور تشریحی صلاحیت کا بھی علم ہو جاتا ہے ۔ اسی بنیاد پر اسے ایک بہترین ذریعہ پیمائش سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن اس خوبی کے ساتھ ہی اس میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس طریقۂ امتحان کے ذریعے مکمل نصابی مواد کی تحصیل کا جائزہ نہیں لیا جا سکتا ۔ پرچہ امتحان میں صرف چند اہم سوالات دے دیے جاتے ہیں اور درسی کتب کا زیادہ حصّہ نظرانداز کر دیا جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ مختلف تحریروں کا اثر ممتحن پر مختلف ہوتا ہے اور ممتحن کے لیے پرچہ جانچتے ہوئے ایک معیار قائم رکھنا دشوار ہو جاتا ہے ۔ اگر ایک ہی پرچہ دو مختلف ممتحنوں کو جانچنے کے لیے دے دیا جائے تو دونوں کے معیار میں تضاد ہو گا بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی جواب ایک ہی ممتحن کو دو مختلف اوقات میں جانچنے کے لیے دیا جائے تو دونوں بار کے نتائج میں تضاد ہو ۔

3 ۔ معروضی امتحانات :

یہ جدید طریقۂ امتحان ہے اور بہت مقبولیت حاصل کر رہا ہے ۔ اس طریقۂ امتحان میں

طالب علم کے دائرہ عمل کو بہت محدود کر دیا جاتا ہے یعنی اسے اپنی پسند سے لکھنے کی آزادی نہیں ہوتی ۔ اس میں سوالات مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن جوابات بہت ہی مختصر بلکہ بعض اوقات صرف ایک حرف یعنی الف ، ب ، ج ، د یا ایک لفظ ۔ اور بعض اوقات دیے گئے جوابات میں کسی ایک کے گرد دائرہ لگانے تک محدود ہوتے ہیں ۔ اس طریقۂ امتحان میں صحیح جوابات پہلے ہی سے متعین ہوتے ہیں ۔ اس لیے انھیں جانچنے میں کسی قسم کے تضاد کا امکان نہیں ہوتا بلکہ انھیں بآسانی جانچا جا سکتا ہے ۔ معروضی سوالات کا بنانا کافی مشکل کام ہوتا ہے لیکن ان کا جانچنا اتنا ہی آسان ہے ۔

اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں مکمل نصابی مواد کو شامل کیا جا سکتا ہے جو کہ انشائی طرز کے امتحانات میں ممکن نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ پرچہ جانچنے میں ممتحن کی اپنی پسند یا ناپسند کو کوئی دخل حاصل نہیں ۔ ایک پرچہ خواہ کتنے ہی ممتحن جانچیں نتیجہ سب کا ایک ہی ہو گا ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طریقہ دن بدن مقبولیت حاصل کر رہا ہے ۔ معروضی امتحانات کی اقسام درج ذیل ہیں :۔

الف ۔ مختصر سوالات : اس قسم کے سوالات میں طالب علم کو ایک یا چند الفاظ میں جواب دینا ہوتا ہے ۔ مثلاً

i ۔ پاکستان کے دارالخلافہ کا نام بتائیے ؟ جواب -----

ii ۔ مادہ کی تین حالتیں بیان کریں ؟ ----------------------

ب) تکمیلی سوالات : اس طرز میں نامکمل جملوں کو کسی ایک لفظ کی مدد سے مکمل کیا جاتا ہے ۔ مثلاً

i ۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کا مزار پاکستان کے تاریخی شہر ---------- میں ہے ۔

ii ۔ سورج -------- سے نکلتا ہے اور -------- میں غروب ہوتا ہے ۔

ج) متبادل جواب (صحیح یا غلط) : اس قسم کی پیمائش میں صحیح اور غلط دونوں اقسام کے بیانات دیے جاتے ہیں اور طالب علم کو ان میں تمیز کرنا ہوتی ہے ۔ جواب کے لیے واضح

ہدایات ہوتی ہیں کہ جواب کی مناسبت سے صحیح یا غلط کے گرد دائرہ لگائیں یا صحیح کا نشان (✓) لگائیں یا پھر خود صحیح کے لیے ص اور غلط کے لیے غ لکھ دیں ۔ مثلاً:

i ۔ آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے
بڑا صوبہ بلوچستان ہے ۔ صحیح ۔ غلط

ii ۔ پودے دن کے وقت آکسیجن اور رات کے وقت کاربن ڈائی آکسائڈ خارج
کرتے ہیں ۔ صحیح ۔ غلط

د) ۔ **تقابلی سوالات :** پیمائش کی اس قسم میں سوالات اور جوابات کی دو الگ الگ فہرستیں بنائی جاتی ہیں ۔ جوابات کی تعداد سوالات کی تعداد سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے ۔ جوابات کی فہرست میں ہر سوال کا جواب موجود ہوتا ہے لیکن دونوں کی ترتیب مختلف ہوتی ہے اور طالب علم کو صحیح جواب چن کر سوال کے سامنے لکھنا ہوتا ہے ۔ مثلاً

نمبر شمار، جواب، فہرست، اشیا	اور پیمائشی اکائیاں
1 ------------ پانی	گرام
2 ------------ کپڑا	لیٹر
3 ------------ چینی	میٹر
4 ------------ وقت	سنٹی گریڈ
5 ------------ حرارت	گھنٹہ

ر) ۔ **کثیر الانتخاب سوالات :** اس آزمائش میں ایک سوال کے چار یا پانچ جواب دیے ہوتے ہیں جن میں سے صرف ایک جواب درست ہوتا ہے اور طالب علم کو اس صحیح ترین جواب کا انتخاب کرنا ہوتا ہے ۔ مثلاً جمہوری طرزِ حکومت میں سب سے زیادہ اہمیت کسے دی جاتی ہے ۔

i ۔ قانون سازی

ii ۔ وزارتوں کی تقسیم

iii ۔ عوام کی رائے

iv ۔ صنعتی اور زرعی ترقی

v ۔ خارجہ پالیسی

4 ۔ عملی امتحانات

اس طریقۂ امتحان میں طالب علم پہلے سے سیکھے ہوئے کام کا عملی طور پر مظاہرہ کرتا ہے ۔ اسے مقررہ وقت میں مطلوبہ عملی کام کو مکمل کرنا ہوتا ہے ۔ ممتحن کام کے دوران میں اس کا جائزہ لیتا رہتا ہے ۔ اس جائزے کا تمام تر دارومدار ممتحن کے اپنے مشاہدے پر ہوتا ہے اور اسی مشاہدے کو بنیاد بنا کر کام کے اختتام پر طالب علم کے نمبر لگا دیے جاتے ہیں ۔ درحقیقت اس طرح کے امتحانات کا بنیادی عنصر مشاہدہ ہے ۔ کسی ورکشاپ ، سائنسی لیبارٹری یا آرٹ کے کمرہ میں کام کرتے ہوئے طالب علم کی کارکردگی کا جائزہ مشاہدے سے ہی لیا جا سکتا ہے ۔ لیکن اس میں بھی وہی خامی ہے جو روائتی طرز کے امتحانات میں ہے ۔ یعنی کام کو جانچنے کا کوئی ایک معیار مقرر نہیں ہو سکتا ۔ پھر بھی مہارتوں کے مطالعہ کے لیے مشاہدہ ایک موثر ذریعہ ہے ۔

مشقی سوالات

1 ۔ نصاب تعلیم کی وضاحت کیجیے نیز تعلیمی عمل میں اس کی اہمیت بتائیے ۔

2 ۔ اچھے نصاب کی خصوصیات پر مختصر نوٹ لکھیے ۔

3 ۔ نصاب کے عناصر کون کون سے ہیں ؟ کوئی سے دو عناصر پر تفصیلی نوٹ لکھیے ۔

4 ۔ نصاب سازی میں مقاصد تعلیم کی اہمیت بیان کیجیے ۔

5 ۔ لوازمۂ نصاب کی وضاحت کیجیے اور اس کی اہمیت بیان کیجیے ۔

6 ۔ نصاب میں طریق تدریس کی اہمیت بیان کیجیے ۔

7 ۔ مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیے ۔

(الف) اکتسابی جائزہ

(ب) مؤثر تدریس

8 ۔ تعلیمی پیمائش کے مفہوم کی وضاحت اور اس کی اہمیت بیان کیجیے ۔

9 ۔ تعلیمی پیمائش کی اقسام بیان کیجیے ۔

10 ۔ ذیل میں دیئے گئے بیانات میں کچھ صحیح ہیں اور کچھ غلط ۔ اگر بیان صحیح ہے تو 'ص' کے گرد اور اگر غلط ہے تو 'غ' کے گرد دائرہ لگائیے ۔

(ا) ۔ جدید تصور نصاب میں درسی کتب کی کوئی اہمیت نہیں ۔ ص غ

(ب) ۔ نصاب تعلیم کا تعلق صرف مدرسہ کی اندرونی سرگرمیوں تک ہے ۔ ص غ

(ج) ۔ نصاب کے بغیر تعلیم کا تصور ادھورا ہے ۔ ص غ

(د) ۔ نصاب تعلیم اور طریق تدریس کی کوئی قدر مشترک نہیں ۔ ص غ

(د) ۔ تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے جس میں معاشرے کے ہر شعبہ زندگی کی خصوصیات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے ۔ ص غ

(و) ۔ موثر تدریس کے لیے مدرس کا کسی ایک طریق تدریس میں ماہر ہونا ضروری ہے ۔ ص غ

(ز) ۔ کوئی بھی ایک طریقہ تدریس سو فیصد درست یا بہترین نہیں ہوتا ۔ ص غ

(ح) ۔ عملِ تدریس ، نصابِ تعلیم اور عمل تعلم میں ربط کا ذریعہ ہے ۔ ص غ

(ط) ۔ براہ راست طریق تدریس ، بالواسطہ طریق تدریس سے بہتر ہے ۔ ص غ

(ی) ۔ سبق کی مناسبت سے مختلف طریق تدریس کو ملا کر استعمال کرنے سے بہتر نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں ۔ ص غ

ذیل میں دیے گئے نامکمل فقرات ، لفظ / الفاظ لکھ کر مکمل کریں ۔

(الف) ۔ مقاصدِ تعلیم کی تکمیل کا بنیادی ذریعہ --------- ہے ۔

(ب) ۔ مختلف مضامین کا تعلیمی اور تدریسی مواد ------- کہلاتا ہے ۔

(ج) ۔ ایسا منصوبہ عمل جس سے مخصوص تعلیمی نتائج حاصل کرنا مقصود ہوں --------- کہلاتا ہے ۔

(د) ---------- تدریس میں طالب علم دیے گئے مسئلہ یا منصوبہ کا اپنے طور پر حل تلاش کرتا ہے ۔

(ہ) ۔ کسی چیز کی تعداد ، مقدار یا خصوصیت کا اندازہ لگانے کا عمل ---------- کہلاتا ہے ۔

12 ۔ ذیل میں ہر سوال کے چار ممکنہ جوابات دیے گئے ہیں ۔ جن میں سے صرف ایک

جواب صحیح ہے ۔ آپ صحیح جواب کے نمبر کے گرد دائرہ لگائیں ۔

الف) ۔ نصابِ تعلیم سے مراد ۔

i ۔ کسی جماعت کے لیے منتخب مجموعہ مضامین ہے ۔

ii ۔ کسی خاص پیشہ سے وابستہ تمام کتب کا مجموعہ ہے ۔

iii ۔ مدرسے کے زیر انتظام مدرسے کی حدود میں تمام تعلیمی سرگرمیاں ہیں ۔

iv ۔ مدرسے کے زیر انتظام طلبہ کو فراہم کردہ تمام سرگرمیاں ہیں چاہے وہ مدرسے کے اندر ہوں یا مدرسے کی حدود سے باہر ۔

ب) ۔ نصاب کے عناصر ؟

i ۔ مقاصدِ تعلیم ، لوازمہ نصاب ، طریق تدریس ، اکتسابی جائزہ ۔

ii ۔ مقاصدِ تعلیم ، مدرسہ کی عمارت ، طلبہ اور لوازمہ نصاب ۔

iii ۔ لوازمِہ نصاب ، طلبہ ، اساتذہ اور طریق تدریس ۔

iv ۔ طلبہ ، اساتذہ ، طریق تدریس اور اکتسابی جائزہ ۔

ج) ۔ معروضی طریق امتحان میں ۔

i ۔ سوالات بنانا آسان ہے ۔

ii ۔ بہت زیادہ سوالات درکار ہوتے ہیں ۔

iii ۔ پرچے دیکھنا مشکل کام ہے ۔

iv ۔ تدریسی مقاصد کی پیمائش غیر موثر ہے ۔

د) ۔ روایتی طریق امتحان میں ۔

i ۔ طلبہ کے لکھنے کی قابلیت کا اظہار نہیں ہوتا ۔

ii ۔ جوابات کے صحیح یا غلط ہونے میں اتفاق کا بہت دخل ہے ۔

iii ۔ نمبر لگانے کا طریقہ قابل اعتماد نہیں ۔

iv ۔ سوالات بنانا مشکل ہے ۔

ہ) ۔ لوازمہ نصاب سے مراد۔

i ۔ مختلف مضامین کا تعلیمی اور تدریسی مواد ہے ۔

ii ۔ طلبہ کی بہبود کے لیے مدرسے کی مجموعی سرگرمیاں ہیں ۔

iii ۔ ایسی ہم نصابی سرگرمیاں جو مدرسہ کی حدود میں ہوں ۔

iv ۔ نظم و نسق مدرسہ سے متعلق تمام اصول و ضوابط ہیں ۔

فرھنگ

اسلوب سفر	سفر کرنے کے طریقے، سفر کے آداب یا اصول۔
اکتسابی جائزہ	طلبہ پر تعلیمی سرگرمیوں کے اثرات کا جائزہ بذریعہ امتحانات
انتظامیات	نظم و نسق
انشائی	ایسا طریقۂ امتحان جس میں طلبہ کو لکھنے کی آزادی ہو۔ مضمون نگاری
پرتخیل	نئے نئے منصوبے سوچنے والا
پرداخت	آراستگی۔ دستگیری۔ پرورش
پیمائش	کسی چیز کے ماپنے کا عمل
تدریسی حکمتِ عملی	پڑھانے کے رہنما اصول یا لائحہ عمل
تدوین نصاب	نصاب سازی
تشکیل نصاب	نصاب سازی، لوازمۂ نصاب اور اسکے متعلق تنظیم
تعلم	علم اور تجربے کی بنا پر انسان میں پیدا ہونے والی تبدیلی
تعلیم	کسی بھی قسم کی واقفیت حاصل کرنے یا بہم پہنچانے کا عمل
تعلیمی حکمت عملی	تعلیمی پالیسی۔ تعلیمی لائحہ عمل
تعلیمی سرمایہ کاری	یہ تصور کہ تعلیم پر اٹھنے والے اخراجات نفع بخش ہوتے ہیں
تعین مقاصدِ	مقاصد تعلیم کے مقرر کرنے کا عمل
تکمیل ذات	فرد کی صلاحیتوں کی مکمل نشوونما

تہذیبی ورثہ	نسل در نسل جمع شدہ معاشرتی سرمایہ
ثقافت	تہذیب ۔ طرزِ حیات
حُسنِ کمال	پسندیدہ تصورات ۔ مہارتوں اور رویوں کا اعلیٰ معیار
حکمتِ تدریس	اصولِ نفسیات ۔ طریقِ تدریس ۔ ضبط طلبہ اور طلبہ کے جائزۂ اکتساب پر مشتمل عمل
حقیقت اصلیہ	ایسا وجود جسے قائم رہنے کے لیے اسباب کی ضرورت نہ ہو
حقیقت ظاہریہ	جو موجود تو ہو لیکن اس کا وجود کسی دوسرے پر منحصر ہو
حیوان ناطق	سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھنے والی مخلوق
دائرۂ عمل	وہ حدود جہاں تک رسائی ہو سکے
دیروز	گزرا ہوا کل ۔ گزشتہ کل
ذہنی بالیدگی	ذہنی ترقی
طبقاتی تفریق	معاشرہ میں گروہ بندی
عقلی غوروفکر	انسانی قوت استدلال اور منطق کے اصولوں پر مبنی اندازِ مطالعہ
علم	جاننا ، پہچاننا یا معلومات رکھنا
علمیات	وہ شعبۂ علم جس کا تعلق علم کی حقیقت کے ادراک سے ہے
فلسفہ	وہ علم جس کا موضوع عقلی غوروفکر کے ذریعے حقیقتِ اصلیہ کا ادراک ہے
کائنات	اللہ کے سوا تمام موجودات ، مادی ہو یا غیر مادی
قدریات	فلسفے کا شعبۂ جس کا تعلق خیروشر کے معیار کے ادراک سے ہے
لوازمۂ نصاب	نصاب میں شامل تمام علوم و مشاغل
محرک	تحریک دینے والا ، ابھارنے والا
متعلم	علم حاصل کرنے والا ۔ طالب علم

مشتملات تعلیم	تعلیم کا مواد
معلم	تعلیم دینے والا۔ مدرس۔ استاد
معاشی اساس	معاشی بنیاد
معاشرتی رویہ	معاشرتی ہم آہنگی۔ معاشرے کے طور طریقوں کے مطابق
معاشرتی روابط	معاشرتی میل جول۔ لوگوں کا آپس میں میل ملاپ
معاشرتی عدم مساوات	معاشرے میں مساوات کا نہ ہونا
معروضی	ایسا طریقۂ امتحان جس میں اپنی خواہش کو دخل نہ ہو
نسیان	بھول جانے کا عمل
نصابِ تعلیم	طلبہ کے لیے مدرسے کی طرف سے فراہم کردہ علوم و مشاغل کا مجموعہ
وجودیات	فلسفے کا شعبہ جس کا تعلق وجود کی حقیقت کے ادراک سے ہے
وظائفِ تعلیم	تعلیم کے فرائض
ہم نصابی سرگرمیاں	ایسے مشاغل جو نصاب میں تو شامل ہوتے ہیں لیکن ان کا امتحان نہیں لیا جاتا۔

متعلقہ مطالعاتی مواد

1 ۔ ابوالاعلیٰ مودودی مولانا سید تعلیمات اسلامک پبلیکیشنز لاہور 1963ء

2 ۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ، دانش گاہ پنجاب لاہور
جلد 10 ، طبع اول ، 1973ء

3 ۔ انتظام اللہ شہابی مفتی اسلامی نظام تعلیم کا چودہ سو سالہ مرقع
جناح لٹریری اکیڈمی ، کراچی ، 1961ء

4 ۔ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز تعلیم اسلامی تناظر میں ،
اسلامی ریاست میں نظام تعلیم اسلام آباد ، 1986ء

5 ۔ ایس ایم شاہد فلسفہ و تاریخ تعلیم ، مجید بک ڈپو لاہور 1982ء

6 ۔ ---------- مسلم فلاسفی ، پبلیشرز ایمپوریم ، لاہور ، 1981ء

7 ۔ خورشید احمد پروفیسر اسلامی نظریۂ حیات شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ ، جامعہ
کراچی 1968ء

8 ۔ سی ۔ اے قادر پروفیسر تعلیمی نفسیات مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور 1977

9 ۔ وصی اللہ خان مرتب فلسفۂ تعلیم ، انجمن فاضلین ، ادارہ تعلیم و تحقیق ، جامعہ
پنجاب لاہور

10. Cron bach, Lec J., EDUCATIONAL PSYCHOLOGY, Harcourt Brace Javanovich, New York, 1977.

11. Decleco, John P and Crow Ford, William R., THE PSYCHOLOGY OF LEARNING AND INSTRUCTION, Prentice Hall Inc.

12. Elizabeth Farrot, EFFECTIVE TEACHING, Longman group Ltd., New York, 1982.

13. Mansoor A. Qureshi, SOME ASPECTS OF MUSLIM EDUCATION Universal Books, Lahore, 1983.

14. Nicholas Audrey and Nicholas Howard, S., DEVELOPING CURRICULUM, George Allen and Unwin, London 1978.

15. Ottaway A. K. C., EDUCATION AND SOCIETY, Routledge and Kegan Paul, London, 1968.

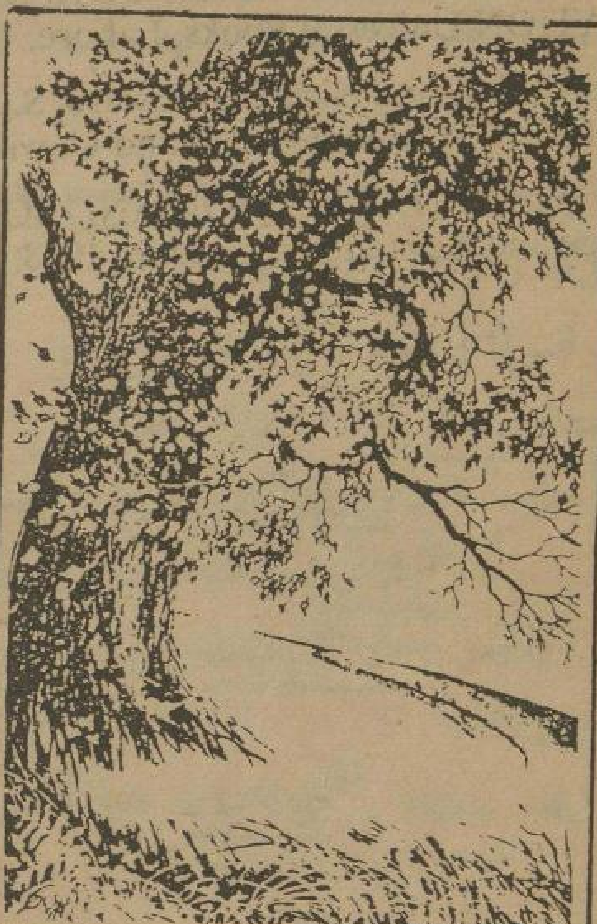

درخت ہماری شان ہیں
پاکستان کی آن ہیں

فرمانِ قائداعظمؒ

آپ کی توجہ صرف حصول علم کے لیے وقف رہے

صرف اسی صورت میں آپ اپنے ملک کو دنیا کا عظیم،

طاقت ور اور ترقی یافتہ ملک بنا کر سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں:۔

(نوجوانوں سے خطاب)

قومی ترانہ

پاک سر زمین شاد باد   کشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالی شان   ارضِ پاکستان

مرکزِ یقین شاد باد

پاک سر زمین کا نظام   قوتِ اُخوتِ عوام
قوم ملک سلطنت   پائندہ تابندہ باد

شاد باد منزلِ مُراد

پرچمِ ستارہ و ہلال   رہبرِ ترقی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال   جانِ استقبال

302

سایۂ خدائے ذوالجلال

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	طباعت	تعداد اشاعت	قیمت
مئی 2002ء	اوّل	19	40,000	15.00